اچھے لوگ۔ بُرے لوگ

خشونت سنگھ

لفی ہمارا ہمسایہ ـــــ سنجے گاندھی ـــــ ستیہ جیت رے

رتسنا مینن۔ اکیلا بھیڑیا ـــــ بلراج ساہنی ـــــ مرارجی ڈیسائی

اتھی برت عورت باز ـــــ نراد چودھری ـــــ گورو گول والکر

شکیلہ بانو

سحر آفریں آواز

رونا لیلے

جادو بھری آواز

دی کے بردھا

مسکراتا ہوا بدھ

منظور قادر

ایک بچھڑا ہوا دوست

جے۔ پی

ایک مکمل انقلابی

اچھّے لوگ ۔ بُرے لوگ

خشونت سنگھ

مکتبۂ شعروادب ○ سمن آباد ○ لاہور ۔ ۲۵

ناشر.......... نواز چوہدری
مطبع.......... شکر گنج پرنٹرز لاہور
قیمت.......... [redacted] روپے

سول ایجنٹ:
چودھری اکیڈمی ○ الفضل مارکیٹ۔ ۱۷۔ اردو بازار
لاہور

ترتیب

۱:۔ زُلفی ..... ہمارا ہمسایہ: ۵
۲:۔ شکیلہ بانو..... سحر آفریں آواز: ۱۵
۳:۔ ڈی۔ کے برواہا..... مُسکراتا ہوا بدھ: ۱۸
۴:۔ بنگلہ دیش کے مجاہدین آزادی: ۲۳
۵:۔ نراڈ چودھری: ۳۴
۶:۔ معجزہ ساز..... دادا جی: ۴۲
۷:۔ موم بتی کی روشنی اور دا تا ئل ۴۵
۸:۔ مرارجی ڈیسائی: ۴۹
۹:۔ سنجے گاندھی: ۶۴
۱۰:۔ گورو گول واکر: ۸۱
۱۱:۔ جے۔ پی..... ایک مکمل انقلابی: ۸۶
۱۲:۔ جادو بھری آواز..... رُونا لیلےٰ: ۹۹
۱۳:۔ ہیرلڈ میکملن: ۱۰۱

۱۴:۔ آندری مال راکس ... دھماکہ خیز قوت : ——— ۱۰۴

۱۵:۔ کرشنا مینن ...... اکیلا بھیڑیا : ——— ۱۱۵

۱۶:۔ فرینک موریس : ——— ۱۲۱

۱۷:۔ گورو دیو۔ مکت آنند : ——— ۱۲۴

۱۸:۔ منظور قادر ...... ایک بچھڑا ہوا دوست : ——— ۱۳۰

۱۹:۔ ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشن ...... ایک تخلیق جوہر : ——— ۱۳۵

۲۰:۔ رامن راگھاؤ ...... اسے پھانسی دو! : ——— ۱۳۸

۲۱:۔ ستیہ جیت رے : ——— ۱۴۶

۲۲:۔ بلراج ساہنی : ——— ۱۵۰

۲۳:۔ بھگوان شری نیل کنٹھ ٹھاکر جی : ——— ۱۵۲

۲۴:۔ ساسھتی بَرت ...... عورت باز : ——— ۱۵۵

۲۵:۔ بالا صاحب ٹھیکری ...... ایس۔ ایس۔ چیف : ——— ۱۶۲

۲۶:۔ دانیال وال کاٹ ...... فضائی سمگلر : ——— ۱۶۷

زُلفی ــ ہمارا ہمسایہ

۱۹۷۶ء میں محمد علی جناح کے سو سالہ جشن ولادت پر وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی جانب سے میں بھی مدعو تھا۔ مجھے بھٹو صاحب سے متعارف کرایا گیا ان کی دوستی میں گرم جوشی تھی۔ میں نے ان سے انٹرویو کی درخواست کی۔ انہوں نے چند روز بعد دن کا کچھ حصہ میرے ساتھ گذارنے کا وعدہ کیا۔ اور آئندہ روز ہی میری ان کی ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو بیک وقت تین شخصیتوں کا مالک ہے جاگیردارانہ مزاج کا حامل سندھی زمین دار، آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ یورپیوں کی طرح خوش اخلاق اور خوش اطوار اور سیاستدانوں کی سی مکاری کا حامل سیاستدان وہ موقعے کے مطابق اپنی شخصیت کے سحر کو بروئے کار لاتا ہے۔

وزیر اعظم بھٹو کی راولپنڈی والی رہائش گاہ کسی خاص طرز تعمیر سے عاری اور ایک منزلہ ہے۔ البتہ اس کے اردگرد پنجابی اور پٹھان دراز قد فوجی سپاہیوں کا حفاظتی پہرہ لیکن یہ پہرہ بھی حقیقت سے زیادہ نمائشی معلوم ہوتا ہے پاکستان میں آنے والے کسی بھی شخص کو ذوالفقار علی بھٹو کی غیر معمولی ہر دل عزیزی بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ پاکستان کی "ایک شخصی جمہوریت" کا بانی اور محافظ ہے۔

اے ڈی سی مجھے اس کمرے میں لے جاتا ہے جہاں انسائیکلو پیڈیا بریٹنیکا کی ضخیم جلدیں کمال احتیاط کے ساتھ قطار اندر قطار رکھی ہیں۔ دیوار پہ استاد اللہ بخش کے سٹائل پر مبنی پنجابی مٹیاروں کی ایک بہت بڑی آئل پینٹنگ آویزاں ہے قریب ہی نرگس کے پھولوں سے بھرا ایک گملا ہے جس سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔ بھٹو صاحب عین اس لمحے اندر آتے ہیں جو ملاقات کیلئے

مختص ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ جلدی میں ہیں اور خوش گپیوں کا وقت نہیں ۔ ہیں فوراً ان سوالوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو میں نے مرتب کر رکھے ہیں

س :۔ شملہ سمجھوتے پر عمل درآمد کے لیے آپ کے ذہن میں کون سے ٹھوس اقدام ہیں؟

ج :۔ شملہ سمجھوتے پر دونوں جانب سے عمل ہو رہا ہے ۔ پاکستان اور بھارت دونوں ہی نے شملہ سمجھوتے میں شامل مسائل میں سے ایک بڑے مسئلے کے علاوہ سب کا حل تلاش کر لیا ہے ۔ تجارت بحال کی جا چکی ہے ۔ ذرائع رسل و رسائل میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ۔ فضائی سفر بحال کیا جا چکا ہے اور دونوں ملکوں کے عوام اس سفر سے مستفید ہو رہے ہیں ۔ حالات معمول پر لانے کا عمل جاری ہے ۔

(میں حالات کے معمول پر لانے کے بارے میں کچھ اور دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ بعد میں پوچھوں گا)

س :۔ لیکن ابھی تجارت اور عوام کی آمد و رفت میں بہت کچھ کیا جانے والا ہے

ج :۔ تجارتی روابط بحال ہونے میں کچھ دیر تو لگے گی ہی ۔ گذشتہ دس گیارہ سال سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت نہیں ہوئی ۔ اب تجارت پیشہ لوگوں اور صنعت کاروں کے درمیان پرانے روابط بحال ہو رہے ہیں یا نئے رشتے استوار ہو رہے ہیں اب نئے معاہدے عمل میں لائے جا رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ اس طرح باہمی مفاد کی خاطر تجارت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا ۔

س :۔ کیا بھارت سے اشیاء خریدنے پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی گئی ۔

ج :۔ عام طور پر تو ایسی کوئی ممانعت نہیں ہونی چاہیئے ۔ جو چیز معیاری ہو گی اور ہمیں دوسرے ملکوں کی نسبت بھارت سے ارزاں نرخ پر ملے گی تو ہم کیوں نہ خریدیں گے لیکن ہم ایسی تجارتی پالیسی وضع نہیں کرنا چاہتے جس کی بنا پر ہماری تجارت کا دارو مدار صرف ایک ہی ملک تک محدود ہو کر رہ جائے اور نہ ہی ہم ان ملکوں کے ساتھ تجارتی روابط ختم کر سکتے ہیں جن کے ساتھ ہم ایک عرصے سے تجارت کر رہے ہیں ۔ ان تجارتی روابط نے ہماری تجارت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے ۔ ہم تجارت کا عمومی ڈھانچہ تبدیل

نہیں کرنا چاہتے ۔ لیکن پھر بھی اصل اہمیت قیمتوں کی اور اشیاء کی کوالٹی کی ہے ۔ لیکن بھارت کے ساتھ تجارت میں کوئی رکاوٹ یا پابندی ہرگز نہیں ۔

س :۔ کیا ایسا خطرہ لاحق ہے کہ کسی ایک شے کی تجارت میں پاکستان ، بھارت کا دست نگر ہو کر رہ جائے گا ۔

ج :۔ اب ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ کسی ملک کا ایسے سلسلے میں دست نگر ہو جانا حقیقت کی بجائے زیادہ خوف پر مبنی ہی ہوتا ہے اگر کسی ملک کو کوئی خاص چیز مہیا نہ ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس ملک کا دم گھٹ کر رہ جائے گا ۔ مثال کے طور پر ١٩٦٥ء میں ہماری فوجی رسد بالکل ختم ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں ہمارے ملک پر پابندی بھی لگ چکی تھی ۔ اس وقت ہمیں صرف امریکہ سے فوجی ساز و سامان ملتا تھا لیکن ہم نے نئے ذرائع تلاش کیے اور ہمیں دوسرے ملکوں سے بھی فوجی سامان موصول ہوا ۔ البتہ وقت کی دشواری کا مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن ذرائع رسل و رسائل کے اس تیز رفتار دور میں اس کی بھی چنداں فکر نہیں ہوتی ۔ نئے سامان سے واقفیت پیدا کرنا اور اس کی تربیت حاصل کرنا بھی ایک مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن اس پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے ہم ایک ہی ملک تک محدود ہونے کا تجربہ کر چکے ہیں اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ صرف ایک ہی ذریعے کے بار آور نہ ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے اس لیے اگر ہمارے تجارتی شعبے کا ایک حصہ بھارت سے لوہے ، سٹیل ، ٹریکٹر یا کسی بھی شے کی تجارت کرتا ہے تو ہمیں محدود ہونے کا اندیشہ نہیں ہو گا کیونکہ آخر کار بھارت بھی تو ہم سے کچھ نہ کچھ خریدے ہی گا اگر باہمی تجارت میں ایسے حالات پیش آئے بھی تو ہم اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں ان سے نمٹ لیں گے اس سلسلے میں ہمیں خاصی مہارت حاصل ہے ۔

(اب میں ایک خاردار سوال کی طرف آتا ہوں)

س :۔ جب آپ کہتے ہیں کہ صرف ایک بڑا مسئلہ باقی رہ گیا ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ کشمیر کی بات کرتے ہیں ؟

ج :۔ ہاں یہ بات درست ہے جموں کشمیر کا مسئلہ ہی وہ واحد مسئلہ ہے جو شملہ سمجھوتے

کے مسائل میں سے باقی رہ گیا ہے اس سمجھوتے کی رو سے مسئلہ کشمیر پر دونوں حکومتوں کے درمیان ہر قسم کے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کسی بہتر ماحول میں گفتگو کرنا طے پایا ہے یہ سوال بہت سے دیگر صحافیوں اور اخبار نویسوں نے بھی مجھ سے پوچھا ہے۔ دونوں ملک اس مسئلے پر مناسب وقت پر باہمی مذاکرات کریں گے۔

اس کے علاوہ سلال ڈیم کا مسئلہ بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کا مناسب حل بھی تلاش کر لیا جائے گا۔ درحقیقت سلال ڈیم بھی مسئلہ کشمیر ہی کا ایک حصہ ہے لیکن اس ڈیم کا مسئلہ معاہدہ سندھ طاس کے تحت بھی آتا ہے اس لئے عام طور پر یہ مسئلہ شملہ سمجھوتے کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ میں ہمیشہ ہی کہتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت کے انتخابات کے بعد ہی دونوں ملک اس مسئلے پر سوچ بچار کریں گے لیکن یہ اس وقت تک کی بات ہے جب آپ کی حکومت نے انتخابات ایک سال تک ملتوی کر دیئے اس کے بعد میں نے یہ بیان نہیں دوہرایا۔ ہم ۱۹۷۷ء میں انتخاب کروائیں گے اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت مذاکرات میں بہتر طور پر شامل ہو گی میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہماری پارٹی کی حکومت بنی تو ہم آپ کی حکومت سے باہمی مذاکرات کریں گے اور اس کا مطلب شملے سمجھوتے پر صحیح معنوں میں عملدرآمد ہو گا۔

س:۔ کیا آپ کے ذہن میں کشمیر کے بارے میں کوئی نئی تجاویز ہیں؟

ج:۔ نہیں نئی تجاویز کی کیا ضرورت ہے۔ شملہ سمجھوتے میں اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن جب مذاکرات کا آغاز ہو گا تو پھر ہم یہ دیکھیں گے دوسرا فریق اس بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور پہلے سے طے شدہ امور پر کتنا عمل کرتا ہے۔ اگر بھارت کا خیال ہو کہ اس مسئلے کے لیے یہ بنیاد مضبوط نہیں تو پھر بھارت ہی کو بتانا ہو گا کہ مذاکرات کن بنیادوں پر ہوں گے۔ پاکستان کی اصولی بنیاد وہی ہے جو ہم ایک عرصے سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں کہتے آئے ہیں۔ اگر بھارت اس طے شدہ امر کو نہیں مانتا تو پھر اسے ہی بتانا ہو گا کہ وہ اس بارے میں کیا کرنا چاہتا ہے ہمارے پاس تو اس کے علاوہ کوئی بنیاد نہیں۔ ہم صرف مسئلے کے جمہوری حل پر یقین رکھتے ہیں یعنی

عوام کی رائے کے مطابق آپ میرے تمام فیصلوں کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں نے کبھی کوئی فیصلہ جمہور کی آواز کے خلاف نہیں کیا۔

س:۔ کیا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ مفید ہو گا؟

ج:۔ یہ مسئلہ بھی شملہ سمجھوتے میں زیر غور آیا تھا اور ہم نے یہ محسوس کیا تھا کہ عدم جنگ کا معاہدہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے تمام مسائل حل ہو چکے ہوں۔ تمام مسائل طے ہونے کے بعد بھی جنگ ہو سکتی ہے لیکن اگر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنا ہو تو پھر پہلے تمام چھوٹے بڑے مسائل حل ہونے چاہیں مثال کے طور پر سندھ طاس معاہدے کے مسائل وغیرہ۔ بالفاظِ دیگر اگر دو طرفہ مذاکرات ناکام ہو جاتے ہیں تو ہم اپنی جگہ واپس آ سکتے ہیں، کوئی درمیانی راستہ اختیار کر سکتے ہیں کسی کو ثالث مقرر کر سکتے ہیں یا پھر بین الاقوامی عدالتِ انصاف سے رجوع کر سکتے ہیں۔ صرف اور صرف بین الاقوامی قانون کے تحت ہم خود اختیارانہ طور پر مسائل کا حل تلاش کریں تو پھر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا نہ ہو تو پھر ایسے معاہدے میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہو گا کہ دونوں حکومتوں نے مسئلہ کشمیر کو التواء میں ڈال دیا ہے۔

س:۔ مسز اندرا گاندھی کے ساتھ آپ کی ذہنی ہم آہنگی کس سطح پر ہے؟

ج:۔ میں نے آپ کو گذشتہ رات بھی بتایا تھا کہ مسز گاندھی نے شملے سمجھوتے میں نہایت کارآمد اور ٹھوس قدم اٹھایا ہے۔ انہوں نے جرأت اور عقلمندی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ اس معاہدے میں مخلص نظر آتی ہیں اور ہمارے ملک کے ساتھ نارمل اور دوستانہ تعلقات کی خواہشمند ہیں۔ گذشتہ پانچ سالوں کے دوران میں تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششیں بارآور ثابت ہوئی ہیں اور یہ صرف اسی صورت میں ہوا ہے۔ کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں معمول کے تعلقات میں مخلص ہیں۔ اس سے آپ خود مسز گاندھی کے ہند و پاک تعلقات کے بارے میں نقطہ نظر سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

س:۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے انہیں پاکستان کے دورے کی دعوت دی ہے؟

ج :۔ جی ہاں ۔ بالکل ۔ شملہ سمجھوتے کے دوران ہی میں نے انہیں اپنے ملک آنے کی دعوت دی تھی اور اس کے بعد بھی میں اس دعوت کا اعادہ کرتا رہا ہوں ۔

س :۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یورپی مشترکہ منڈی کی طرح بنگلہ دیش ، پاکستان اور بھارت کی بھی کوئی ایسوسی ایشن بن سکتی ہے ۔ ؟

ج :۔ فی الحال تو میں ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کی طرح ان تین ملکوں کے درمیان اس قسم کا کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کیونکہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی صورت حال ایسی ہے جیسی کہ یورپی ملکوں کے درمیان معاہدے کے وقت تھی اگرچہ یورپی ملکوں کے درمیان کوئی شدید اختلافات نہیں تھے پھر بھی انہیں اس معاہدے پر پہنچنے کے لیے خاصی دیر لگی ۔ یورپی ملکوں میں سیاسی شعور پختہ ہو چکا ہے ۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ وہ حکومتیں خاصی پرانی ہیں یا ان کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے ، بلکہ ان کے درمیان چھوٹے بڑے مسائل سلجھانے کی قوت اور استعداد بھی ہے ان ملکوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ صرف ایک ہی نشست میں طے نہیں پا پایا تھا ۔ یورپی ملکوں کے درمیان پاکستان ، بھارت اور بنگلہ دیش جیسے معروضی حالات نہیں ۔ ابھی ہمارے تعلقات پختہ نہیں ہوئے ۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش اور بھارت کے درمیان وہ تعلقات نہیں جو آج سے دو سال پہلے تھے ۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بھارت ، بنگلہ دیش سے اپنے شکستہ تعلقات بحال کرنے کی کوشش میں ہے ۔ فرخا بیراج کے بارے میں وزارتی سطح پر جو مذاکرات ہو رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ملک اپنے کشیدہ تعلقات کی بہتری کی خاطر معروفِ عمل ہیں لہٰذا اولین ضرورت تو یہ ہے کہ بھارت اور بنگلہ دیش کے باہمی تعلقات بہتر صورت اختیار کر جائیں ۔ اسی طرح بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں ابھی پختگی کی کسر ہے اسی طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان بہت کچھ کرنا باقی ہے جب ہم تینوں ممالک اپنی اپنی سطح پر ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تب ہی کسی بڑے سمجھوتے یا ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھنے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے ۔

س :۔ پاکستان نے چین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو قریب لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔ کیا پاکستان ہمارے درمیان ایسا نہیں کر سکتا ؟

ج :۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان

س :۔ نہیں بھارت اور چین کے درمیان ۔ ؟

ج :۔ خوب ! بھارت اور چین نے سفارتی سطح پر کچھ تبدیلیاں نہیں ہیں اور یہ بہت سی نمایاں تبدیلی ہے اور میرے خیال میں آپ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری کی صورت نظر آ رہی ہے ۔ لیکن چین ایک بڑی طاقت ہے اور ہمیں بڑی طاقتوں کی سیاست کا خیال بھی رکھنا ہے ۔ بھارت اور چین کے تعلقات کی بہتری ، پاکستان کے کسی اقدام پر منحصر نہیں ہے کسی بھی چھوٹے ملک کے دنیا کی تین بڑی طاقتوں میں سے کسی کے ساتھ تعلقات کا انحصار کلی طور پر مختلف عناصر پر ہے ۔

س :۔ میں آپ سے کچھ اندرونی ملکی مسائل کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں آپ نئی روشنی کے فرد ہیں ۔ آپ اپنے ملک میں ترقی پسندانہ قوانین لانے کے لیے مقامی علماء کے رویے کے بارے میں کیا کہیں گے ۔ !

ج :۔ مجھے ان سے کسی خطرے کی توقع نہیں ۔ ماضی میں علماء نے حکومتوں کو کافی پریشان کیا ۔ بعض تو علماء کے حق میں تھیں ۔ بعض بالا قتدار یا پارٹی کی سطح پر ان سے بیزار تھیں ۔ میرا ان کے ساتھ بالکل مناسب رویہ ہے ۔ ایک ترقی پسند مسلمان کی حیثیت سے میں ان کے سامنے ہوں مجھے اعتراف ہے کہ اس معاشرے میں ان کی ایک حیثیت ہے ۔ لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ سماجی سدھار میں ان کی حیثیت کوئی بنیاد مہیا کرتی ہے ۔ اسی لیے میں پاکستانی معاشرے کو جدید بنانے کے لئے اپنی اصلاحات نافذ کر رہا ہوں ۔ نہ ہی میں ان کے ساتھ کسی قسم کا تصادم چاہتا ہوں ۔ میں اپنی اصلاحات کی وضاحت ان کے سامنے اسی انداز میں پیش کرتا ہوں جو انداز وہ سمجھتے ہیں ۔ اس سے فائدہ ہوا ہے ۔ میری پارٹی !! ؟

س :۔ کیا آپ نے قانونِ شریعت میں بھی کوئی اہم اصلاحات کی ہیں ؟

ج :۔ بالکل نہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلامی عائلی قوانین جو کہ قانونِ شریعت پر مبنی ہیں ہمارے ملک میں نافذ ہیں۔ صرف "سرداری قوانین" اور قبائلی قوانین کو ختم کر کے قانونِ شریعت نافذ کیا گیا ہے۔ یہ ترقی کی طرف ایک قدم ہے۔ بلوچستان اور سرحد کے کچھ علاقے میں سرداروں کے بنائے ہوئے جاگیردارانہ قوانین کو ختم کر کے وہاں قانونِ شریعت کی بالادستی قائم کی گئی ہے۔

س :۔ تعدد ازدواج اور طلاق کے قوانین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ خواتین آج بھی ان قوانین کا جبر برداشت کر رہی ہیں۔

ج :۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے۔ تاہم عورتوں کی آزادی کی خاطر تعدد ازدواج اور پردہ اور طلاق کے بارے سوچ رہے ہیں۔ ہم نے خواتین کے لیے زیادہ ملازمتیں مہیا کی ہیں بلکہ حکومتی سطح پر اہم ملازمتیں۔ اب وہ ملک کے تقریباً ہر شعبے میں موجود ہیں۔ اس طریقے سے ہم ان میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور معاشرے میں باعزت مقام مہیا کرنے میں ان کی مدد کر رہے ہیں

س :۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج :۔ ہمارے ہاں اسقاطِ حمل کو قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے اور ہم اسے قانونی تحفظ دیں گے بھی نہیں۔ ہم نے خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں زبانی بات چیت کی بجائے عملی اقدام کیے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو اس کی تعلیم دی ہے ہم نے خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں لوگوں کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے ہے۔ اب وہ عام طور پر مانع حمل ادویات استعمال کرتے میں ہرج نہیں سمجھتے۔ ان خطوط پر عمل پیرا ہو کر ہم بہتر نتائج حاصل کر رہے ہیں ایسے نتائج جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ فائدہ مند ہوں گے۔ لیکن ہم کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتے کیونکہ اس سے بعض اوقات برعکس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

س :۔ پاکستان میں نس بندی کا کوئی پروگرام نہیں ؟

ج :۔ نہیں صرف رضاکارانہ طور پر نس بندی کا انتظام ہے۔ قطعاً رضاکارانہ۔

س :۔ پاکستان میں اقلیتوں کا کیا حال ہے۔ غالباً ان کی تعداد آبادی کا ۵ فیصد ہے۔

ج :۔ جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے میں آپ کو بلاخوفِ تردید بتا سکتا ہوں کہ ہم ان کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں مقننہ اور صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی ہے۔ ان کے معاملات کے لیے ایک الگ وزارت موجود ہے اور حال ہی میں ان کے حوالے سے ایک ہفتہ بھی منایا گیا ہے۔ ملازمتوں کے حصول یا میڈیکل یا پیشہ ورانہ تدریس کے کالجوں میں داخلے کے لیے اقلیتوں پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ حکومت میں شریک ہیں اور ہمارے بعض اقلیتی برادر تو بیرونی ملکوں میں سفیر بھی ہیں۔ اسی طرح میری حکومت نے ان کا اعتماد زیادہ بلند کیا ہے اور انہیں احساس دیا ہے کہ وہ بھی مساوی شہری حقوق کے حامل ہیں۔

س :۔ پاکستان چونکہ ایک اسلامی ریاست ہے اس لیے کیا وہ اپنے آپ کو دوسرے درجے کا شہری نہیں سمجھتے۔

ج :۔ ہرگز نہیں۔ ایسا سمجھنے کی ان کے پاس کوئی وجہ نہیں۔

س :۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی سربراہِ ملک بننے کی خواہش نہیں کر سکتا۔

ج :۔ یہ صرف پاکستان میں ہی نہیں۔ برطانیہ میں صرف ایک پروٹسٹنٹ ہی شہنشاہ ہو سکتا ہے اور دوسرے ممالک میں بھی ایسی پابندیاں ہیں۔ بات اصولی اور علمی سطح کی ہے۔ ملک کی پچاسی سے نوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے لہٰذا وہ جب بھی کسی کا انتخاب کریں گے تو وہ ان ہی میں سے ایک ہوگا۔

س :۔ کیا آپ قائداعظم کے سو سالہ جشنِ ولادت پر کوئی پیغام دیں گے۔

ج :۔ میں اس سلسلے میں پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس وقت ہم اس جشن کی تقریبات کے آخری ہفتے میں ہیں۔ آپ چونکہ ایک بھارتی شہری ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ قائداعظم نہ ہندوؤں کے خلاف تھے۔ نہ بھارت کے۔ پہلے پہل۔ اپنے کیریئر کے آغاز میں قائداعظم کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اخوت کا سفیر کہا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں جب ان کو یقین ہوگیا کہ وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے

توانہوں نے پاکستان کا نعرہ لگایا۔ لیکن آپ کو یاد ہو گا کہ پاکستان کی تخلیق کے بعد بھی قائداعظم بہتر ہندو پاک تعلقات کے خواہاں تھے۔

اس وقت ہم تعلقات کو معمول پر لانے کی بات کر رہے ہیں۔ قائداعظم نے اس وقت یہ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی بات کی تھی۔ اور وہ بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے زبردست خواہش مند تھے۔ بھارت کے ساتھ اچھے تعلقات ان کی نظر میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ اگر پاکستان کی پیدائش کے سال بھر بعد اُن کا انتقال نہ ہو جاتا تو یہ بات زیادہ وضاحت سے سامنے آتی۔ قانون ساز اسمبلی میں اُن کی تقاریر سیکولر رجحان کی حامل تھیں۔ انہوں نے ہندوؤں کو پاکستان میں رہنے اور ہجرت نہ کرنے کی کوشش بھی کی، جب ۱۹۴۸ء میں کراچی میں فسادات برپا ہوئے تو قائداعظم بہت فکر مند ہوئے۔ قائداعظم کی اس سوچ کو زیادہ عام نہیں کیا گیا لیکن وہ موجود تو ہے۔ اگرچہ وہ پاکستان کے خالق اور بانی تھے تاہم انہوں نے بھارت یا بھارت کی قومی برتری کے بارے میں کبھی بغض کا اظہار نہ کیا۔ وہ تو بھارت اور پاکستان کو سویڈن اور ناروے کی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ دو الگ الگ ملک لیکن خود اختیار، مساوی اور دوستی کے رشتے میں جڑے ہوئے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تو بمبئی میں اپنا گھر محفوظ رکھنا چاہتے تھے تاکہ اگر کبھی وہاں جائیں تو دو چار ماہ گذار سکیں۔ یہ ان کی اولین سوچ تھی مگر بدقسمتی سے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو گئے اور تعلقات بدتر ہوتے گئے۔

ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے قائداعظم کی اس قسم کی تقاریر اور بیان پس پشت ڈالنے کی کوشش کی۔ حیدرآباد، جوناگڑھ اور کشمیر میں ہونے والے واقعات کے باوجود قائداعظم باہمی خوش گوار تعلقات پر مصر تھے۔ یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید یہ مسائل پیش ہی نہ آتے۔ لیکن ان کی موجودگی میں ایسا ہوتا بھی تو وہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے تمام مسائل حل کر لیتے۔ یہ تھا قائداعظم کا نقطہ نظر۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض اوقات تاریخ کے کچھ اوراق گم ہو جاتے ہیں اور ہم بہت سی اہم واقعات اور عوامل سے محروم رہ جاتے ہیں۔

شکیلہ بانو — سحر آفریں آواز

شکیلہ بانو — ایک نابغہ روزگار۔ اس ملک میں کسی مرد، عورت، سیاسی لیڈر، شاعر، فلم ایکٹر یا مذہبی رہنما نے لوگوں کے دلوں پر حکومت نہیں کی سوائے شکیلہ بانو کے جس کی آواز میں وہ جادو ہے جو کئی گھنٹوں تک لوگوں کو حرکت کرنے سے باز رکھتا ہے۔ ایک درشت آواز جیسی ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں سانس کی تکلیف ہو، ایک قبول صورت چہرہ لیکن میک اپ زدہ اور موٹاپے کی جانب مائل جسم، اس کا لباس بھی اس کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ سفید زمین کو چھوتا ہوا لباس اوپر سے سبز، زرد پھولوں سے ڈھکا ہوا سونے اور چاندی کے رنگوں کی لیس سے مرصع جس پر گول ٹکے چمک رہے ہیں۔ زیورات سے لدی پھندی۔ عروسی ٹیکہ کان میں بالیاں، ناک میں نتھ، نیکلیس بازوؤں میں سنہری بازوبند، مارلن منرو کی طرح کی جنسی نفاست۔

شکیلہ بانو وقت کی پابند نہیں اور اس وجہ سے بہت بدنام ہے۔ لوگ انتظار کرتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، بلبوں اور کتوں کی آوازیں نکالتے ہیں لیکن پنڈال چھوڑ کر جاتے نہیں۔ "ایک گھنٹہ انتظار کیا مطلب۔" اس کے کسی سازندے سے پوچھ لیجئے۔ "وہ تو ولایت میں بھی دیر سے پہنچی تھی۔"

شکیلہ بانو کسی مغل ملکہ کی طرح نمودار ہوئی ہے خدمتگاروں کا ایک گروہ اس کے گرد ہوتا ہے۔ پاندان بردار، آبدار، پنکھا کرنے والا اور بہت سے دوسرے ایسی ملکہ سے لیٹ آنے پر کون جواب پرسی کر سکتا ہے۔ لوگ تو بس اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے اور وہ بغیر کسی ہنگامے کے شروع ہو جاتی ہے

وہ اپنے سامعین کے دلوں پر جادو سنک دیتی ہے مائیکروفون پر گلا صاف کرتی ہے۔ اُسے تنگ کرنے کے لیے ہزاروں لوگ گلے صاف کرتے ہیں۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں ہر ایک چہرے پر مرکوز کرتی ہے اس مصنوعی ناراضگی سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے اور مجمع قہقہوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ آرکسٹرا کو خاموشی کا حکم دیتی ہے اور مائیکروفون پر گہرا سانس لیتی ہے۔ ہال کے تمام کونوں سے لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ انہوں نے اس کا ہر نغمہ سن رکھا ہے تاہم وہ اسے بار بار سننا چاہتے ہیں۔ وہ احتجاج کرتی ہے اور پھر وہ آخری لفظ ادا کرتی ہے۔ اس کا آخری لفظ ہوتا ہے۔ "ہاں"۔ وہ اپنے چوٹی کے نغمے سے شروع کرتی ہے "بہار آئے"۔ لوگوں نے سینکڑوں دفعہ یہ نغمہ سنا ہے۔ شکیلہ اسے ہر مرتبہ نئے شعروں اور دوہوں کے ساتھ تازہ کرتی ہے۔ وہ تمام سامعین کو اپنی آواز کے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ وہ دیر سے آنے والے کے لیے رکتی ہے۔ اسے سرزنش کرتی ہے اور پھر طنزاً کہتی ہے "حضور ہم نے آپ کا خاصا انتظار کیا۔ اب ہمارا دل مطمئن ہے"۔ وہ مردوں سے فلرٹ کرتی ہے لیکن عورتوں کو بھی نہیں بخشتی۔ "بہن۔ یہ ہمارے لیے ہے۔ میرے اور تمہارے لیے"۔ وہ نغمے کے کسی بول کی طرف متوجہ کر کے کہتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سننے والوں میں سے بہت سے اس کی اردو اور فارسی نہیں جانتے۔ پھر وہ آسان ہندی میں ترجمہ کر ڈالتی ہے۔ اور پھر بالکنی میں کسی اونچی کرسی پہ بیٹھے سردار کی طرف فقرہ پھینکتی ہے۔ "سردار جی۔ یہ آپ کے لیے"۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ سردار اس کا کوئی گہرا دوست ہے لیکن شکیلہ کے لیے سب برابر ہیں۔ ہر کوئی ہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی زیادہ دوست ہے۔

مون سون کا گیت شروع ہوتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں۔ ڈھول پیٹا جاتا ہے اس کی ماں جمیلہ بانو آہستہ آواز میں شامل ہوتی ہے۔ عبدالوحید خاں اپنی بلند آواز سے ساتھ دیتا ہے۔ شکیلہ اسے گھورتی ہے۔ وہ آہستہ کر لیتا ہے۔ قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ ان قہقہوں پر وہ پھر فقرے پھینکتی ہے۔ اس کا بھائی ادریس محمد خاں جو ہر قسم

کا ساز بجا لیتا ہے اپنے موٹے پیٹ سے گڑگڑاتا ہوا ہنستا ہے اور ساری محفل اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔

شکیلہ کسی ملکہ عالیہ کی مانند اپنا ہاتھ روک لیتی ہے۔ خاموشی۔ "جگنو"۔ کوئی بالکنی سے چیختا ہے۔ وہ جگنوؤں کے بارے میں ایک آدھ شعر سناتی ہے۔ جگنو اور مچھر۔ لوگ یک آواز چلاتے ہیں۔ شکیلہ بانو لطیفہ سناتی ہے "ایک آدمی مچھروں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چادر میں چھپا لیتا ہے۔ مچھر مایوس ہو کر چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رضائی سے سر نکالتا ہے تو ایک جگنو کو اوپر اڑتے ہوئے دیکھتا ہے غصے سے کہتا ہے۔ "چالاک مچھر۔ تم اندھیرے میں مجھے تلاش کرنے کے لیے دیا لے کر آ گئے ہو"۔ قہقہے ایک بار پھر بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی دلآویز حرکت سے لوگوں کو خاموش کراتی ہے اور مون سون کا نغمہ سننے کے لیے کہتی ہے۔ یہ شکیلہ بانو ہے۔ جمیلہ بانو کے پانچ بچوں میں سب سے بڑی۔ اس نے یہ فن اپنی ماں سے حاصل کیا ہے۔ لیکن اس کی آواز کا کرشمہ صرف دیوتاؤں کی دین ہے۔ شکیلہ سے بہتر قوالی گانے والے موجود ہیں لیکن کسی کو اتنی خوش بختی حاصل نہیں کہ شکیلہ کی طرح سننے والوں کے دریا موجود ہوں۔

جب نوابین، بیگمات اور وزرائے اعلیٰ کے نام لوگوں کی یادداشت سے نکل جائیں گے تب لوگ بھوپال کو صرف ایک ہستی کے نام سے یاد رکھیں گے اور وہ ہے بھوپال کی بیٹی شکیلہ بانو ——

ڈی ۔ کے ۔ بروہا ۔ مُسکراتا ہُوا بُدھ

آپ نے چین کا مسکراتا ہوا بدھ تو دیکھا ہو گا۔ وہی زرد رنگت، نشیبی آنکھوں والا۔ منگولی نقوش، پھولا ہوا پیٹ اور ہنسی کا گول گپا۔ یہ ہیں ہمارے ڈی۔ کے۔ بروہا۔ ایک باتونی آدمی ۔۔ ہر وقت باتیں کرنے والے اور ہر وقت کھانے والا۔ مونگ پھلی کھانے کے دوران وہ لطیفے پر لطیفہ سنائے جاتا ہے جو بہت سے اس کے خلاف ہی ہوتے ہیں ۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ تاریخ، ادبیات، آرٹ، فن تعمیر، مذہب اور سیاست اس کی گفتگو کے موضوعات ہیں۔ سیاست پر بہت کم گفتگو کرتا ہے۔ بعض اوقات تو مجبوراً سیاست کو چھیڑتا ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا سوال پوچھنا چاہیں جو اسے پسند نہ ہو تو وہ آپ کی سنی ان سنی کر دینے کا فن جانتا ہے۔ ایک سیاسی کارکن میں شاید ہی یہ عجیب و غریب عادتیں موجود ہوں جب اس سے ہمارا تعارف ہوا تو وہ آسامی شاعری پر بحث کر تا تھا۔ ویسے ٹی ایس ایلیٹ، ٹیگو، رد سیٹی اور ٹینی سن اس کے پسندیدہ شاعروں میں ہیں۔ وہ سون براؤن اور براؤننگ کی شاعری پسند کرتا ہے حیرانی کی بات ہے کہ اس نے سولہ سال کی عمر میں نظم مصرا لکھنی شروع کی اور پھر ۳۰ سال کی عمر میں اپنا قلم رکھ دیا۔ کبھی نہ اٹھانے کے لیے ۔ اس کے خاص موضوعات کیا تھے؟ دوسرے تخلیقی فن کاروں کی طرح موت اور وقت۔ ہاں محبت بھی۔ انسانی حقیقت اور فلسفیانہ معروضیت ۔ اس کی بہترین نظم وہ قرار پائی جس میں انسانی ارادے اور تقدیر کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان قدیم جھگڑا۔ یہ نظم لکھنے میں آدھ گھنٹہ اور مونگ پھلی کے دو بڑے پیالے صرف ہوئے۔ دوسرے لوگ بھی اس سے متعارف ہونا چاہتے تھے لیکن وہ ادھر ادھر کونوں کھدروں میں سرگوشیاں

کرتا پھر رہا تھا۔ ہمارے سیاستدان تاریک کونوں میں سرگوشیاں کرنے میں بڑے راضی رہتے ہیں لیکن وہ جلد ہی واپس آگیا اور میرے گھٹنوں پر دوستانہ طور پر ہاتھ جماتے ہوئے بولا ۔۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔۔"

اور اب وہ ذات پات پر بحث کر رہا تھا۔ کہ سکھوں کی کوئی ذات نہیں، کھتری بھی تھے، تجارت پیشہ بھی، جنگجو، شاعر، فلاسفر اور نہ جانے کیا کچھ۔ کیا سکھوں کے دس کے دس گرو کھتری نہیں تھے۔؟ اور رنجیت سنگھ کے بہترین جرنیل۔ محکم چند دیوان چند اور ہری سنگھ نلوہ ۔ کچھ اور مونگ پھلیاں اور اخروٹ صرف ہو گئے اور مجھے انٹرویو کے لیے دیا گیا بہت سا وقت بھی۔ اب پھر وہ ایک مقامی سیاسی لیڈر سے کھسر پھسر کے بعد میری طرف آیا اور کہنے لگا۔ اور ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔۔ میں نے اس ارنے بھینسے کو سینگ سے پکڑنے کی کوشش ۔

س : ۔ آپ کی پارٹی کا تاثر بہت غلط ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا کر رہے ہیں ؟ اس نے میرے اس حملے سے اپنے آپ کو دلیری سے بچایا۔ بلند آواز سے قہقہہ لگایا اور بولا

ج : ۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ سیاسی غلط فہمی ہے۔ ہمارا تاثر اتنا خراب نہیں جتنا آپ لوگ سمجھتے ہیں۔ ابھی ہمیں لوگوں کا اعتماد حاصل ہے۔ میں ابھی بہار کے دورے سے واپس آیا ہوں اور مجھے علم ہے کہ عوام بڑی تعداد میں ہمارے ساتھ ہیں صرف پٹنہ جیسے شہروں میں کچھ لوگ جے پی کے ساتھ ہیں۔ دیہاتی علاقوں کے لوگ تو کانگریس کے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے اجلاس اور جلسے کوئی کسوٹی نہیں ہیں صرف انتخاب ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی رائے کیا ہے ۔

س : ۔ حزب اختلاف کا کہنا ہے کہ آپ روپے کے زور پر انتخاب پر اثر انداز ہوتے ہیں

ج : ۔ دوسری پارٹیوں کے پاس ہم سے زیادہ سرمایہ ہے جے پی جو ٹپنا ایک جہان جاتا ہے۔ بذریعہ طیارہ جاتا ہے۔ انتخابی اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ سب پارٹیوں پر یہی الزام ہے"۔

اس نے مجھے پھر جلسوں اور جلوسوں سے نتیجہ اخذ کرنے پر انتباہ کیا "پنجاب میں کیا ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ کی آواز پر سینکڑوں ہزاروں لوگ جلسوں میں آئے لیکن ووٹ انہوں نے اکالیوں کی بجائے کانگرس کو دیئے۔"

وہ جانتا تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ بھی کھتری ہے۔ بھاپا۔ اس کی سب سنتے ہیں لیکن حکومت کے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ صرف ایک جاٹ ہی حکومت کے لائق ہے۔ میں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے۔ ذیل سنگھ جاٹ نہیں ہے نہ ہی مسافر لیکن میں اسے اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ پٹڑی سے اتر کر مذہبی مسائل میں گھر جائے میں نے کانگرس پر اپنا حملہ جاری رکھا۔

س: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے جارج فرنینڈ کا چیلنج کیوں قبول نہ کیا۔ اس نے اپنے پرچے میں پارلیمنٹ کی بے انتہا توہین کی ہے اور کچھ ممبران اسمبلی کو دلال تک کہا ہے۔ کانگرس نے اس کا نوٹس نہ لے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری کانگرس کو منظور ہے۔

بروہا نے میری بات کو ایک مختصر اور ذومعنی فقرے سے رد کر دیا۔ "نہیں فرنینڈ شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا اور ہم اس کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہتے تھے" اور پیشتر اس کے کہ میں اسے اس مسئلے پر اور زیادہ کریدتا مگر اس نے کمال ڈھٹائی سے کام لے کر موضوع تبدیل کر دیا۔ "جیسا کہ میں کہہ رہا تھا۔" وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ کسی امیر خاندان کا فرد نہیں ہے۔ اس کا باپ ایک سکول ٹیچر تھا۔ آسام میں بڑی زمینداریاں نہیں ہیں۔ کسی کے پاس بھی چار ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں۔ آسامیوں کو دولت کی اتنی پرواہ نہیں۔ زیادہ امیر لوگ روپے پیسے کے بل پر انتخاب نہیں جیت سکتے کیونکہ وہاں دولت طاقت نہیں خرید سکتی۔

بروہا کوئی ذات نہیں بلکہ ایک قسم کا عہدہ ہے۔ براہمن بروہے اور کھتری بروہے ہیں اور ہاں مسلمان بروہے بھی ہیں۔ قوم کے اعتبار سے میں کالستھ ہوں لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نہ ہی ذات پات کے فرق سے۔ فخر الدین

مجھ سے بہتر آسامی ہے۔ جب ہندو مت اور اسلام آسام میں داخل ہوئے تو مذہب کی گرین بنیاد مجروح ہو گئیں۔

س: میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے اسے اس کے مذہبی اعتقادات کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

ج: میں مذہبی ذہن نہیں رکھتا۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ میں مذہبی رسوم کی پابندی نہیں کرتا۔ ہمارے خاندان کی روایات "لبرل" ہیں۔ گذشتہ چار سالوں میں میں بنارس میں تھا لیکن میں ایک دفعہ بھی مندر میں نہیں گیا اور نہ ہی اشنان کرنے گنگا۔ لیکن مجھے موقع ملا تو میں نجف اور کربلا بھی ہو آیا۔

س: میرا خیال ہے انہوں نے آپ کو مکے میں گھسنے نہیں دیا ہوگا۔

ج: اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور پھر اپنے مخصوص موضوع پر گفتگو کرنے لگا کہ کس طرح کھتری، پوتا پوتوں سے ملتے ہیں۔ سکندر اعظم کس طرح نجات دہندہ ثابت ہوتا ہے۔

س: میں اسے پھر بیسویں صدی میں لے آیا۔ "اندرا گاندھی کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔"

ج: اپنے باپ کی مانند وہ بھارت کی مقبول ترین لیڈر رہے۔ مسز گاندھی میں یا کانگرس کے کاموں میں کیڑے نکالنے کا فیشن سا ہو گیا ہے۔ جب میں نے وزارت پٹرولیم و کیمیکل کا انتظام سنبھالا تو لوگوں نے کہا کہ ملک سے باہر کی زندگی بڑی سہانی ہے۔ میں ملک سے باہر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ جب میں روم میں تھا تو میں پکچر گیلری جانا چاہتا تھا۔ اگر ہڑتال نہ ہو اور عجائب گھر کھلتا ہو تو آپ وہاں جا سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہاں ہڑتال ہو چکی تھی اور گیلری بند تھی۔"

وہ انڈونیشیا، ملائیشیا اور یورپی ممالک میں پیش آئے واقعات کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ میں ایک دفعہ پھر اسے گھیر گھار کر ملکی صورت حال

کی طرف کھینچ لایا۔

س: حکمران جماعت کا عوام کے دلوں میں کیا تاثر ہے اور آپ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیں گے۔

ج: تاثر کوئی طے شدہ بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک جاری عمل کا نام ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام کو خوراک مہیا کرنی ہے۔ اگرچہ زراعت کا کاروبار نجی شعبے میں ہے تاہم حکومت کو اس سلسلے میں کارروائی کرنا چاہئے اور خوراک محفوظ کرنی چاہیئے اور پھر اسے عوام میں تقسیم کرنے کے لیے باقاعدہ تنظیمی سطح پر کام کرنا چاہئے"

یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ سیاست پر بہت کچھ کہہ چکا ہے۔ اور اس کا احساس ہوتے ہی وہ اپنے محبوب موضوع کی طرف پلٹ آیا۔ "کیا تم بھاپا ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

نہیں۔ میں کھورانہ ہو جیسے ہرگوبند تھا جسے نوبل انعام ملا تھا۔ کیا بردہا کاستھوں میں سے بھی کسی نے نوبل انعام حاصل کیا ہے۔

"بردہا کاستھ۔" وہ ہنسی سے دوہرا ہو گیا۔ "وہ سب کے سب بے کار لوگ ہیں۔"

بنگلہ دیش کے مجاہدین آزادی

پاکستانی افواج کی بنگالیوں کی نسل کشی کی مہم کے نتیجے میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات کو مکتی فوج کا قیام عمل میں آیا۔ یہ صرف دس ہزار تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی لیکن جلد ہی یہ گونو باہنی یعنی عوامی فوج آزادی کی شکل اختیار کر گئی اور اس کے مسلح مرد و خواتین کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار سے تجاوز کر گئی اور لاکھوں ابھی اور شامل ہونے کے لیے تیار تھے امن پسند بنگالیوں کی روحوں کو کچلنے کے لیے یہ فولاد کیسے تیار ہوا۔

۱۲ نومبر کی صبح کو برطانوی جھنڈا لہرائے سات ہزار ٹن وزنی سامان اٹھائے "سی آف سینٹ ایل نبز" دریائے ہوگلی کے دہانے سے برآمد ہوا۔ اور کلکتہ کی جانب آیا۔ اس کی فولادی دیواروں میں ۔ چھوٹے بڑے سوراخ تھے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک۔ اگلے روز ایک مقامی اخبار نے تصویروں سے مرصع کہانی شائع کی جس میں مکتی باہنی کے اس بحری جہاز کو نقصانات پہنچانے پر روشنی ڈالی گئی۔ ریاست کی حکومت نے فوراً اس ایلیے پر سوچ بچار کیا۔ کسی فوٹوگرافر کو اس کی تصویریں لینے کی اجازت نہ دی گئی اور صرف ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ جاری کیا گیا جس میں یہ بتایا گیا کہ جہاز پر کہیں مشرقی پاکستان کے ساحل پر حملہ کیا گیا ہے۔

میرے ذہن میں بہت سے سوال ابھرے۔ کیا جہاز سامان لے کر مشرقی پاکستان جا رہا تھا۔ سامان کس قسم کا تھا۔ اس پر حملہ کس نیت سے کیا گیا کیا پاکستانی سمندری حدود میں یا بین الاقوامی پانیوں پر۔ حملہ آور کون تھے۔ کیا یہ واقعی مکتی باہنی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر فرض کیا جاتا ہے۔ تو پھر ان کے پاس فوجی بحری کشتی کہاں سے آگئی جس کی مدد سے انہوں نے حملہ کیا۔

چار روز بعد میں نے گارڈن ریچ کے علاقے میں جانے کا اجازت نامہ حاصل کیا

جہاں جہاز لنگر انداز تھا۔ ساحل پر بہت سے مزدور اور کلرک پھر رہے تھے گودی مزدور جہاز سے مشینری نکال کر سیڑھیوں سے اتر رہے تھے اور خوش گپیوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو کر اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے سوراخ گننے لگا۔ چھبیس میرے قریب ہی ایک شخص نے زور سے کہا۔ "اتنے ہی دوسری جانب بھی ہیں۔" "تو ہے مکتی باہنی" میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہ کیسے اندازہ لگایا ہے کہ یہ مکتی باہنی کا کام ہے۔ "اور کس کا ہو سکتا ہے" اس نے جواب دیا۔ "یا تو ان کا کام ہے یا ہمارا — ان کی فتح ہماری فتح ہے اور ان کی شکست ہماری شکست ہے۔"

کچھ اثر و رسوخ اور کچھ کوشش سے میں نے جہاز کے اندر جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ رات گئے میں جہاز کے کپتان ہانس اور اس کی خوبصورت بیوی مسز روزمیری ہانس کے پاس بیٹھا واقعے کی تفصیلات حاصل کر رہا تھا۔ کپتان ایک طیم شحیم سکاٹش تھا اور اس واقع سے اسے جو شہرت حاصل ہوئی اس کا مزہ لے رہا تھا۔ "میں گذشتہ ہفتے ایک برطانوی بیڑے پر تھا۔ میں نے بذاتِ خود کچھ نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی میں اس واقعے کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہوں جب تک کہ انکوائری ختم نہیں ہو جاتی۔ ہمارا بحری اتاشی دہلی سے پہنچ چکا ہے اور اس نے تمام نقصان کا مشاہدہ کیا ہے۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔" کپتان نے کہا پھر اس نے مجھے بتایا کہ کیا ظاہر ہو چکا ہے۔ "سٹی آف آل نیز" تھوڑی دیر پہلے ہی سامان اتارنے کلکتہ آیا تھا۔ ۱۱ اکتوبر کو پچھلے پہر کو لنگر اٹھا لیا گیا اور جہاز خلیج بنگال میں تیرتا ہوا مشرقی پاکستان کی دوسری بڑی بندرگاہ چالنا کی طرف روانہ ہوا جہاں سے اسے پٹ سن لادنا تھی۔ تقریباً ساڑھے ایک بجے کوئی گن بوٹ یا زیادہ گن بوٹس کسی نامعلوم علاقے کی طرف سے آئیں اور انہوں نے جہاز کو چھلنی کر دیا۔" دس منٹ کی یہ ایک خوفناک واردات تھی۔" روزمیری ہانس نے کہا۔ "مجھے اس کا تجربہ جنگ عظیم دوم میں ہو چکا ہے۔" کپتان نے بات جاری رکھی۔ "لیکن اگر کوئی کہے کہ وہ اس واقعے سے خوفزدہ نہیں ہوا تو وہ بہت بڑا جھوٹا ہے میری آنکھوں کے سامنے تو اندھیرا چھا گیا۔ میں نے جہاز کا رخ موڑا اور واپس کلکتے کی جانب روانہ ہو گیا۔"

"سوراخ سائز میں ایک جتنے ہی ہیں، کیا خیال ہے ایک ہی ہتھیار استعمال کیا گیا ہے — غالباً پام۔ پام —" میں نے پوچھا

نہیں سوراخ ایک جتنے نہیں ہیں۔ کپتان نے کہا۔ "میں اسلحے کا ماہر تو نہیں تاہم اتنا ضرور اندازہ ہے کہ ایک سے زائد ہتھیار استعمال ہوئے ہیں۔ ہم نے کچھ خول اکٹھے کیے ہیں اور بحری اتاشی کو دیے ہیں۔"

"اس سے کوئی نتیجہ نکلا —؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں — مجھے تو فی الحال کسی پر بھی شبہ نہیں۔"

کرنل محمد عطا الغنی عثمانی، مکتی باہنی کا کمانڈر انچیف ہے۔ وہ پچاس سال کا ایک دبلا پتلا آدمی ہے۔ اس کی سیاہ رنگت پر سفید ہینڈل بار کی مانند سفید مونچھیں عجیب لگتی ہیں۔ وہ کرنل BLIMP کے انداز میں صاف اور شستہ انگریزی بولتا ہے اس کی گفتگو میں اینگلو انڈین ملٹری سٹائل کی مانند "اولڈ بوائے" "بکا" اور "جالی گڈ" کے الفاظ کثرت سے سننے میں آتے ہیں۔ بے کسی اور غمگینی اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہے۔ جو ایک گھنٹہ میں نے اس کے ساتھ گذارا اس میں اسے مسکراتا ہوا نہیں دیکھا۔ اپنی رزمیہ جنگوں اور اپنے جوانوں کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں جگمگا اٹھتی ہیں، جب وہ پاکستانی فوج کے بنگالیوں پر ظلم و ستم کی بات کرتا تھا تو اس کی آنکھوں میں نفرت کا الاؤ ہوتا تھا۔

کرنل عثمانی تک پہنچنا آسان نہیں۔ جب بھی اسکے بارے میں پوچھا جائے ایک ہی روز پتہ ملتا ہے۔ "کسی جگہ بنگلہ دیش کے اندر ہی —"

مجھے اس کی جھونپڑی تک مسلح نگرانی میں لے جایا گیا۔ وہ ایک کرسی پر بڑے خبردار طریقے سے بیٹھا تھا اور ایک گیس لیمپ اس کے سر پر روشنی کر اس کے سامنے کی میز بالکل ننگی تھی۔ اس کی جھونپڑی کی دیواریں تصویروں یا کیلنڈروں سے عاری تھیں حتیٰ کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی تصویر بھی نہیں تھی۔ اس نے بڑی درشتی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور بغیر وقت ضائع کیے پوچھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتا ہے۔

میں نے سٹی آف آل بیز کے بارے میں پوچھا۔ کرنل عثمانی کو اس جہاز کے محل وقوع اور ایک غیر مسلح جہاز پر یا غیر جانب دار ملک پر حملے کے بارے میں مکمل آگاہی تھی۔

'یہ ہمارے پانیوں میں تھا اور بغیر اجازت کے آیا تھا اور ہمارے دشمن کے ساتھ تجارت کر رہا تھا محض ایک جہاز کو نقصان پہنچنے پر دنیا اتنا واویلا کر رہی ہے۔ یہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب پاکستانی حملہ آور معصوم عوام کو قصائیوں کی طرح ذبح کر رہے تھے بچوں اور عورتوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ زنا ہو رہا تھا۔ لوٹ مار مچی تھی اس وقت کسی قوم کو یہ خیال نہ آیا کہ ان کو روکا جائے۔ اس وقت بین الاقوامی اخلاقیات کہاں سو چکی تھی۔ بتایئے؟"

میں نے جہاز کا ذکر چھوڑنا مناسب سمجھا اور مکتی باہنی کی بنیاد کی طرف آیا۔

اس کا ظہور ۲۵ اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو ہوا جب پاکستانی فوج نے بنگالیوں کو فرقہ وارانہ دہشت پسند عناصر قرار دے کر ختم کرنے کی مہم شروع کی۔ ان کے مقابلے میں ہمارا ارادہ کوئی فوج کھڑی کرنے کا نہیں تھا میں ایک سپاہی ہوں اور میں اس روایت پر عمل کرتا ہوں کہ فوج کو سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات میں نے پہلے کسی کو نہیں بتائی جو آپ کو بتا رہا ہوں۔ ۱۹ مارچ کی شب جب یہ افواہ ملی کہ پاکستانی افواج بنگالیوں کا قلع قمع کرنے والی ہیں تو شیخ مجیب الرحمان نے مجھے سینئر بنگالی افسروں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کو کہا تاکہ ہر قسم کی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے تیار رہا جائے میں نے ایک باعتماد ساتھی میجر خالد مشرف کے ذریعے ایک خفیہ سرکلر ان افسروں کو بھیجا۔ میں نے تین واضح نکات پیش کیئے۔

۱۔ سیاست میں ملوث نہ ہوں۔

۲۔ کسی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں۔

۳۔ جارحیت کا جواب سرکوبی سے دیں۔

اگر پاکستانیوں کی سرگرمیوں کا حلقہ صرف بنگالی سیاستدانوں تک ہوتا تو بنگالی افواج غیر جانب دار رہتے۔ لیکن جب ہمیں معلوم ہوا کہ ہر قابل بنگالی اور سینئر آفیسرز کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے تو پھر ہم نے پاکستانی فوج ہی پر مشتمل مکتی باہنی بنائی۔ اس طرح ہم نے

انقلاب لانے۔ کرنل عثمان نے مجھے کسی انفرادی شخصیت کا نام نہیں بتایا لیکن ہمایوں رشید چوہدری جو اکتوبر ۷۰ء تک دہلی میں پاکستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر رہا اور پھر بنگلہ دیش بھی اس نے مجھے بتایا کہ فوجی کارروائی سے کئی ہفتے پہلے سینئر بنگالی افسروں کو تبدیل کر دیا گیا تھا یا ان کو بہتر اہم جگہوں پر تعینات کر کے جوانوں کے ہاتھ میں کمان دے دی گئی تھی۔ میجر عثمان چوا ڈنگا، میجر خالد مشرف، کومیلا اور میجر ضیاء کو کہیں چٹاگانگ کے آس پاس تعینات کیا گیا۔ بنگالی فوجیوں اور پولیس کے سپاہیوں نے ان نوجوان افسروں کو اپنا آقا تسلیم کیا اور اس طرح تقریباً دس ہزار تربیت شدہ افراد کی ایک فوج تیار ہو گئی ان لوگوں نے کرنل عثمانی کو اپنا کمانڈر انچیف مقرر کیا جو پہلے ہی عوامی لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کی رکنیت حاصل کر چکے تھے۔

مکتی باہنی کے کئی گروپ تھے۔ ان کی سیاسی قیادت شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی پارٹی کے ممبران کرتے تھے ان میں سے بیشتر چالیس اور پچاس کے دھاکوں میں تھے اور اگرچہ ان میں ہتھیار اٹھانے کی سکت نہیں تھی تاہم لوگوں نے ان کو حوصلہ دے رکھا تھا وہ دسمبر ۷۰ء کے انتخاب میں قومی اسمبلی کے لیے ۱۶۹ میں ۱۶۷ نشستیں جیت چکے تھے۔

فوجی گروپ میں ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز، پولیس، انصار اور مجاہدین پر مشتمل تھا۔ ۲۵ مارچ کے قتل عام میں یہ دس ہزار جوان بچ رہے یہ فوجی دستہ غیر سیاسی تھا۔ ان میں سے بہت سوں کو اپنے ہی رنج تھے مثلاً بنگالیوں کے مقابلے میں دوسرے لوگوں کو ترقی دینے کا رنج۔ زیادتیوں اور جبر کا رنج، اگر پاکستانی فوج انہیں نہ چھیڑتی تو شاید یہ بھی الگ ہی رہتے۔

تیسرا گروپ رضاکاروں پر مشتمل تھا (جو لوگ جسمانی طور پر اس قابل نہیں تھے انہوں نے الگ گروپ بنالیا) اس میں اکثر سکول اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی تھی جن کی عمریں پندرہ سے بیس سال کے درمیان تھیں۔

اس گروپ پر سیاسی نظریات نے خاصا اثر دکھایا۔ دو کمیونسٹ پارٹیاں تھیں پیکنگ نواز پارٹی کے لیڈر بھاشانی تھے اور ماسکو نواز پارٹی مظفر گروپ کہلاتی تھی۔

فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور بھی اپنی اپنی ٹریڈ یونین کے حوالے سے ان پارٹیوں میں شامل تھے۔ اگست ۱۹۷۰ء میں بائیں بازو کے اتحاد کی کوشش کی گئی اور کوآرڈی نیٹنگ کمیٹی آف لیفٹ یا سی۔ سی۔ ایل کی تشکیل دی گئی۔

مزید ایک گروپ طالب علم راہنماؤں اور ان کے پیروکاروں پر مشتمل وجود میں آیا۔ ان کے دو واضح طالب علم لیڈر تھے۔ طفیل احمد، اور فضل الحق مونی۔ انہوں نے زیادہ اچھی اور بہتر فوجی تربیت حاصل کر رکھی تھی اور بنگلہ دیش میں ان کی حیثیت ایک طاقت کی مانند مانی جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مجیب باہنی کہتے تھے۔ میں مکتی باہنی کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ کرنل عثمانی نے اعداد و شمار بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ "میں اسے گونو باہنی یعنی عوامی فوجِ آزادی کہتا ہوں کیونکہ ہر بنگالی ایک سپاہی ہے۔" کرنل عثمانی نے کہا بہت سے سرکاری حلقوں کے مطابق یہ تعداد پچاس سے ساٹھ ہزار کے درمیان تھی جو یکایک ایک لاکھ پچاس ہزار ہو گئی۔ پہلے پہل یہ صرف اور صرف مسلمان فوج تھی بعد میں تقریباً تین ہزار ہندو بنگالی اس میں شامل ہو گئے۔

ہو سکتا ہے کہ بنگالی صحیح چھاپہ مار ثابت نہ ہو سکے ہوں لیکن انہوں نے بم بازی، بارود اور پستول کے استعمال میں اپنا فطری رجحان ثابت کیا۔ برطانوی راج کے دوران، بنگالیوں نے ہندوؤں کی نسبت کہیں زیادہ برطانیوں کو دہشت گردی کے ذریعے قتل کیا تھا اور ان میں سے بہت سوں کا تعلق مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش کے موجودہ علاقوں سے تھا کسی باقاعدہ گن مین یا بم باز کو مکمل طور پر گوریلا بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

مغربی پاکستان کی پنجابی اور پٹھان حکومتوں نے بنگالیوں کے خلاف امتیاز روا رکھا۔ انہوں نے ایسٹ بنگال رجمنٹ اور آرمڈ کانسٹیبلری کا کچھ کچھ خیال نہ کیا اور بہت ہی کم بنگالیوں کو اعلیٰ عہدوں پر ترقی دی۔

۱۹۷۰ء تک صرف ایک لیفٹیننٹ جنرل تھا کسی بنگالی کو نیوی یا ایئر فورس میں مغربی پاکستان کے مطابق رینک نصیب نہ ہوا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے ایک پنجابی پاکستانی دوست سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مشرقی علاقے کی آبادی کل آبادی ۵۶ فیصد ہے۔

لیکن فوج میں صرف سات فیصد افراد کیوں ہیں۔ تو اس نے ناک سکیڑتے ہوئے نفرت سے کہا "یہ دال بھات کھانے والے لوگ لڑنا کیا جانیں۔ فوج کوئی بھیڑوں کا گلہ نہیں ہو گی۔"

معظم چوہدری جس کا تعلق سلہٹ سے تھا اور جو شیخ مجیب الرحمٰن کا دوست تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بنگالی نوجوانوں نے اپنے آپ کو فولاد کیسے بنایا۔ "تم جانتے ہو کہ ہم امن پسند لوگ ہیں ان پنجابیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کی درندگی نے ہمیں لڑنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کی پرواہ نہ کی۔ ایک ذلیل سے ذلیل جانور اپنے گلے اور اپنے خاندان کی حفاظت کرتا ہے۔ نفرت لوگوں کو لڑائی پر مجبور کرتی ہے۔" یقیناً بنگلہ دیشیوں کے ذہنوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

"اپنے ان امریکی دوستوں کو بتا دینا" کرنل عثمانی نے کہا، "کہ جو کچھ پاکستانی فوج نے ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو کیا وہ سو MY LAIS کے بھی زیادہ ہے۔ جب تک ہم ان کا صفایا نہیں کر لیتے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے ان کی لاشیں بنگلہ دیش میں ذلیل ہوں گی اور ہم ان کے بھوت مغربی پاکستان بھیجیں گے"

مجاہدینِ آزادی تعداد اور فوجی استعداد میں ترقی کرتے گئے۔ دو ماہ کے بعد اس کا نام مکتی فوج سے تبدیل کر کے مکتی باہنی (تنظیم) کر دیا گیا۔ اس تنظیم کا دائرہ کار اتنا وسیع تھا کہ ہر شخص گوریلے کی مانند جہازوں، کشتیوں اور دریاؤں کے پلوں کو تباہ کر سکتا تھا۔ گروپ کیپٹن خوندکار، بنگلہ دیش ایئر فورس کا ایئر مارشل مقرر کیا گیا۔ اگرچہ ان کے پاس بہت کم پائلٹ تھے تاہم ان کا کوئی جہاز بھی اپنے ہینگر میں نہیں تھا۔

مشرقی پاکستان اور بھارت کے بارڈر کے ساتھ مکتی باہنی کے کئی ٹریننگ گروپ تھے۔ حفاظت کی خاطر ان سنٹروں کے نام کبھی نہیں بتائے گئے اور صرف یہ جواب ملا ہے۔ کہ بنگلہ دیش کے اندر کسی جگہ۔" اسی طرح تربیت اور تنظیم کو بھی خفیہ رکھا گیا۔" بس آپ سمجھ لیں کہ ویت نام میں گوریلا تنظیم کی تربیت بھی ایسے نہیں کی گئی ہو گی۔ کرنل

عثمانی نے کہا پہلے پہل میں نے اپنی فوج کو روایتی فوجی سٹائل کی تربیت دی اور ہم روایتی فوجی لڑائی لڑے۔ ہمارا خیال تھا کہ غیر ملکی مداخلت کی وجہ سے یہ لڑائی ترک جائے گی اور پاکستانی فوجوں کو واپس جانے کے لیے کہا جائے گا۔ لیکن جب ایسا نہ ہوا اور پاکستانی فوج کی تعداد اسی ہزار ہو گئی جن کے پاس ٹینک، بھاری توپیں اور بم تھے تو میں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی۔ ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو میں نے اپنی فوج کی تنظیم نو کی اور انہیں گوریلا لڑائی کی تربیت دی۔ ہمیں زمین کی ضرورت تھی اور ہم نے اپنے مخالفوں کو شکست دے کر مجبور کر دیا کہ وہ دیہاتوں کی طرف بکھر جائیں۔ ہم نے ان کے ذرائع رسل و رسائل ختم کر دیئے۔ انہیں دہشت زدہ کر دیا۔ ہم ہر روز ایک سو کے قریب لوگوں کو مارتے تھے اور ان کے جہاز کفنوں سے بھرے ہوئے واپس جاتے تھے۔ ابھی کل ہی میرے ایک کمانڈر نے کامیاب حملے کے بعد کومیلا سے چینی اور امریکی ساخت کا اسلحہ حاصل کیا ہے ــــ"

ٹریننگ کیمپ میں ملاقاتی لڑکوں کو صرف انڈرویر یا لنگی میں ورزش کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ ان لڑکوں کے ہاتھ میں لکڑی کی بندوقیں ہیں۔ اصل ہتھیار کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ یہ اسلحہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا تو جواب ملتا کہ دشمن سے یا پھر سپاہی اور فوجی بغاوت کے بعد اپنے مرکزوں سے یا پھر اپنے بیرونی دوستوں سے بھی خریدا گیا ہے۔" وہ کہتے ــ

جب میں نے کرنل عثمانی سے پوچھا کہ آبی بارودی سرنگیں اور فوجی گن بوٹ بنگلہ دیش میں کہاں سے آئیں تو اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا

تربیت کا عرصہ چند ہفتوں سے چھ ماہ تک کام کی نوعیت کے مطابق پھیلا ہوتا تھا کسی گاڑی کو پٹڑی سے اتارنا یا سڑک پر بارودی سرنگ لگانا۔ بہت آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے۔ ایک مارٹر یا سٹین گن چلانے کی تربیت یا پانی کے نیچے تیرتے ہوئے بارودی سرنگیں بچھانا ذرا مشکل اور طویل عرصے کا کام ہے۔

مکتی باہنی کی فتح کے دعوی کی تصدیق بڑی مشکل ہے ــ کرنل عثمانی نے کہا۔

ستمبر ۱۹۷۱ء تک ہم پچیس ہزار پاکستانی سپاہی قتل کر چکے تھے۔ اکیس جہاز ڈبو دیئے۔ اور ۶۰۰ دریاؤں کے پُل مکمل طور پر تباہ کر دیئے۔ ریل کی پٹڑیاں اتار دیں۔ سڑک، دریا، پل ہر ذریعہ رسد کو تباہ کر دیا۔ آپ خود تصدیق کر سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں صرف چند گاڑیاں چل سکتی تھیں اور چالنا کی بندرگاہ مکمل طور پر بند تھی۔

بھارت کی دفاعی ضروریات کی تعلیم گاہ کے تجزیے کے مطابق بنگلہ دیش میں قتل ہونے والے پاکستانیوں کی تعداد ۶۰۰۰ کے قریب ہے۔ حکومت پاکستان کی مکتی باہنی کے خلاف نشری مہم نری بنگلہ دیش ریڈیو اور کلکتہ سے شائع ہونے والے ایک اخبار کی بنا پر دب کر رہ گئی بہر حال اطلاعات کے دو با اعتماد ادارے ضرور موجود تھے۔ جہازوں پر موجود بنگالی عملہ جو مشرقی پاکستان سے آیا تھا۔ غیر ملکی ریڈیو، ٹی وی اور اخبار کے نمائندے جنہیں بلا تکلف ڈھاکے سے باہر جا کر حالات کا خود جائزہ لینے کی اجازت تھی بنگالی بحری عملے کے پاس جہازوں کے تباہ ہونے کی بے شمار کہانیاں تھیں۔ ستمبر ۱۹۷۱ء کے تیسرے ہفتے میں سولہ ہزار ٹن وزنی برطانوی ٹینکر TEVICT BONK کو چالنا کی بندرگاہ پر بے اندازہ نقصان ہوا۔ اس کے فوراً بعد ایک دس ہزار ٹن وزنی برطانوی جہاز "چاکدنیا" تباہ ہو کر کلکتہ کی بندرگاہ پر مرمت کے لیے چلا گیا ان لوگوں نے کئی پاکستانی اسٹیمر اور کوسٹل ٹینکر بندرگاہوں پر الٹے پڑے ٹوٹی پھوٹی حالت میں دیکھے ۱۴ اگست یعنی پاکستان کے یوم آزادی پر OHRMAZO پر چٹاگانگ میں کیا گیا۔

اکتوبر، نومبر ۱۹۷۱ء کے دوران مکتی باہنی کے کمانڈوز نے اپنی سرگرمیاں مستحکم کر لیں ۹ اکتوبر کے روز مغربی پاکستان کے تحت کام کرنے والے ڈھاکہ کے مرکزی حبیب بنک میں بم کا دھماکہ ہوا۔ اس عمارت میں ورلڈ بنک کا ایک دفتر بھی واقع تھا جس کے فرشوں کو نقصان پہنچا۔ اور ایک پٹ سن کا گودام جل کر راکھ ہو گیا۔ بھارت میں تجزیہ نگاروں کے مطابق زمانہ امن میں بنگلہ دیش میں ذرائع نقل و حمل ۴۸ فیصد ریل کے ذریعے ۴۳ فیصد سڑک کے ذریعے تھے۔ موجودہ حالت میں ان کا دس فیصد سے کم رہ گیا تھا اور دریائی راستے بالکل ناپید تھے۔ پٹ سن زرمبادلہ کمانے کے لیے پاکستان کی سب سے بڑی

صنعت تھی۔ اس کی نقل و حمل قلیوں کے ذریعے ہوئی تھی۔ صنعتی پیداوار عام حالات سے ۳۵ فیصد کم ہو گئی۔ تمباکو کی پیداوار دس فیصد کم ہو گئی۔ چائے کے گیارہ باغ جو سرحد کے قریب تھے بند ہو گئے باقی کی پیداوار میں ۲۵ فیصد کی کمی ہو گئی۔ یہ سب مکتی باہنی کو بتایا گیا تھا جس کے بارے میں ڈھاکہ کے پاکستان آبزرور کا خیال تھا کہ "یہ موت اور تباہی کی ایک بے رحم تنظیم ہے جو ملک میں افراتفری مچا رہی ہے اور مایوسی اور بے یقینی کے حالات پیدا کر رہی ہے ـــ"

بنگلہ دیشی کمانڈوز کی فتح کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ بھارتی صحافیوں اور فوٹو گرافروں کو بالجبر بنگلہ دیش کے باہر اکٹھا کر لیتے تھے اور مدعو کرتے تھے۔

میری آخری ملاقات اس وقت کے وزیر خارجہ بنگلہ دیش کے اخوندکر مشتاق احمد سے ہوئی۔ جب میں اس کے پی اے کے کمرے میں پہنچا تو یہ ملاقاتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں سوویت صحافیوں کی ایک ٹیم کو بنگلہ دیش کے بارے میں تفصیلات بتائی جا رہی تھیں۔ نقشے کی مدد سے بتایا جا رہا تھا کہ مکتی باہنی "کس کس علاقے پر قبضہ کر چکی ہے بنگلہ دیش کے قبضے میں کیا ہے۔ پاکستانی فوج کہاں پر ہے ـــ" ترجمان سوالوں کا مطلب بتا رہا تھا ـــ

"صحیح اور درست علم تو ابھی مشکل ہے ـــ" ترجمان نے کہا۔ "جہاں پاکستانی فوج فی الحقیقت موجود ہے وہ علاقہ ان کے پاس ہے اور باقی کا علاقہ ہمارے قبضہ میں ہے رات کو وہ تمام بیرکوں پہ قابض ہوتے ہیں جن میں وہ سوتے ہیں۔ ہمارے جوان ان کے ساتھ براہ راست مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس ٹینک اور طیارے ہیں جبکہ ہمارے جوانوں کے پاس صرف رائفلیں، گرنیڈ، اسٹین یا مشین گن ہیں۔ جونہی ہمارے پاس اسلحے کی تعداد میں اضافہ ہوا ہم ان کا مقابلہ کھلے میدان میں کریں گے اور اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی ـــ"

اطلاعات ختم ہوئیں۔ سوویت پارٹی کے لیڈر نے ایک مختصر سی تقریر کی اور کہا کہ جمہوری طاقتیں بہر حال فتح حاصل کریں گی۔ بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملانے اور جھک کر

کر آداب بجا لانے کے بعد روسی "طائفہ" "جے بنگلہ دیش" کے نعرے لگاتا ہوا چلا گیا۔

خوندکر مشتاق احمد بڑا خوش لباس آدمی ہے وہ بنگلہ دیش کی کابینہ کا سب سے بااثر وزیر ہے۔ جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے لیے سگریٹ رول کر رہا تھا "یہ رمضان کا مہینہ ہے ـــ" میں نے اسے یاد کرایا۔ "آپ روزے سے نہیں ـــ" وہ مسکرایا "مجھے معلوم ہے اور شب برات بھی آج ہے لیکن جہاد کے دوران روزے کی معافی ہے یہ ہماری جنگ آزادی جہاد ہے"۔

ہم دیر تک بنگلہ دیش کے بارے میں غیر ملکی رد عمل پر باتیں کرتے رہے اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور کہنے لگا۔ "میرے دوست! ہم کبھی نہیں بھولیں گے کہ بھارت نے آزمائش کی اس گھڑی میں ہمارے لئے کیا کیا ہے ـــ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے دس ملین لوگ بھارت میں پناہ گزیں ہیں اور بھارت انہیں خوراک اور دیگر چیزیں مہیا کر رہا ہے آزاد بنگلہ دیش دائمی دوستی کے معاہدے کی صورت میں یہ قرض اتار دے گا ـــ"

"قوموں کی یادداشت زیادہ تیز نہیں ہوا کرتی ـــ" میں نے کہا وزیر خارجہ ششدر رہ گیا پھر بولا ـــ "کیا امریکہ نے اپنی آزادی کی جنگ کے دوران فرانس کی مدد بھلا دی ہے؟ نہیں ہم اپنے دوست بھارت کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس کا مطلب خود اپنے آپ کو بھلا دینا ہو گا ـــ

نراد چوہدری

"کل صبح دس بجے آجاؤ" ـــ مجھے توقع نہیں تھی کہ نراد چوہدری سے اتنی آسانی سے انٹرویو کا وقت مل جائے گا۔ وہ نوجوانوں کی ایک دعوت میں تھا۔ وہ اسے تنگ کر رہے تھے لیکن وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لڑکے اس کی جنس کے بارے کتاب "THE CONTINENT OF CIRCE" کے ریفرنس کے بارے پوچھ رہے تھے وہ نہایت جوشیلے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تمام اطراف میں گردش کر رہے تھے اس کی نازک سا جسم اوپر نیچے چھلانگ لگا رہا تھا ایک لڑکی پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ لڑکیوں کے ملازمت کرنے کے خلاف کیوں ہے۔ "ہر خاندان کو مہذب لوگوں کی طرح ایک ہی کمانے والے کا محتاج ہونا چاہیے ہر عورتوں کو وہ کام کرنا چاہیے جو قوم کے مستقبل کے لیے ضروری ہے ـــ ایک مہذب گھریلو زندگی اور بچوں کی نمو و افزائش اور تعلیم و تربیت ـــ ایک مہذب قوم کے لیے عورتوں کے لیے کمائی کرنے سے زیادہ یہی کام اہم ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہندوستانی قوم کا قدیم اشرافیہ کا نظریہ کیا تھا ـــ؟ اعلیٰ ترین مرد بے پناہ محبت کرتا ہے اور بے پناہ بہادر ہوتا ہے اور اعلیٰ ترین عورت صرف بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اور میں اس سے بالکل متفق ہوں۔"

اس کے جواب میں گہری خاموشی ہوتی ہے۔ ذرا زیادہ عمر کے لوگ جو ذرا فاصلے پر کھڑے ہیں آخری الفاظ سنتے ہیں۔ وہ اسے غصے کی نظروں سے دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں کہ یہ بوڑھا ہماری نوجوان نسل کو خراب کر رہا ہے۔

لیکن جوان لڑکی بضد ہے اور جلدی جان چھوڑنے والی نہیں "مسٹر چودھری آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کیا آپ متضاد بات نہیں کر رہے ـــ میں نے آپ کا ایک آرٹیکل

پڑھا تھا جس میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ مرد کی نسبت ہندوستانی عورت زیادہ مہذب ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر عورت صرف محبت کے لیے مخصوص کیوں ہو ـــ"

ایک شریر مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آتی ہے۔ اُسے اس بات پر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ لوگ اسے غور سے پڑھتے ہیں لیکن وہ محصور ہوتے ہوئے بھی نہیں ہارتا۔

"کیا تمہیں علم ہے شادی کے وقت میں نے اپنی بیوی سے کیا کہا تھا ـــ؟ میں اس سے زیادہ ذہانت رکھتا ہوں ـ میں بہانہ بازی برداشت نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر ذہنی بہانہ بازی وہ بھی عورت کی جانب سے۔ عورتیں ان معاملات میں مردوں کی نسبت زیادہ غیر سنجیدہ ہوتی ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورتوں کی تعلیم کم ہو اگر کوئی عورت تعلیم حاصل کرے تو وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہی زیادہ باشعور اور حالات کو سمجھنے والی گردانتی ہے ـــ لیکن ـــ تم ذرا مختلف ہو" ـ جوان لڑکیاں بہر حال کم حساس نہیں ہوتیں۔ "فرض کرو اگر خاوند مر جاتا ہے اور بھارت میں بیوہ کے لیے دوبارہ شادی کرنا ممکن نہیں تو پھر وہ اپنے بچوں اور اپنی زندگی کے لیے کیا کرے؟"

"نراد چودھری ہنستا ہے۔ اتنی سنجیدہ نہ ہو" وہ ایک امریکن کی طرف رُخ موڑتا ہے "عورتوں کا کام کرنا جس طرح کہ وہ تمہارے معاشرے میں آتی ہیں صدیوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔" وہ فوراً موضوع تبدیل کرتا ہے "جانتے ہو کل میں نے امریکی طلباء سے کیا کہا ـــ میں نے کہا کہ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ کیونکہ میں اپنے مستقبل کے راہنماؤں سے خطاب کرنے آیا ہوں تمہیں معلوم ہے دہلی میں امریکی سفارت خانہ وہائٹ ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے ـــ" امریکی شرم سے مسکراتا ہے۔

ہندوستانی صرف جبر کی حالت میں محنت کرتے ہیں ـــ بالکل اس طرح جس طرح انگریزوں نے ہم سے محنت کروائی اور ہمارا بہترین جوہر حاصل کیا۔ امریکی بھی آئندہ پچیس سے چالیس سال کے دوران ہی کریں گے۔ تہذیب ہندوستان میں دوبارہ رائج ہو گی لیکن اس کے آلات ہمارے نہیں ہوں گے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہمارے لیے ایک بڑی خوش قسمتی تھی زیادہ تر قوم اس سے نابلد ہی رہتی ہیں

ہم نے بیس سال ضائع کر دیئے ہیں اور اب امریکیوں کا آنا ناگزیر ہے یہ مایوس نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور میں اس کا استقبال کروں گا کیونکہ اسی میں قوم کی بقا ہے۔"

"کیا ہم خود کچھ نہیں کر سکتے —" کوئی پوچھتا ہے۔

"نہیں — ہندوستان کے ہر دس میں سے نو افراد کوئی پیداواری کام نہیں کرتے وہ سب طفیلی ہیں۔ وہ معاشرے سے باہر رہتے ہیں۔ کلکتہ میں مجھ سے پوچھا گیا کہ آیا کلکتہ کا کوئی مستقبل ہے؟ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ سوائے اس کے کہ آدھی سے زیادہ آبادی شہر سے باہر نکل کر گاؤں میں جا کر کام کرے۔ کلکتے کی تباہی کا بڑا باعث بنگالی انٹیلی جنس کی سست رفتاری اور صرف تنخواہ کھانے کا رویہ ہے اگر آپ کسی بنگالی یا ہندو کو کہیں کہ آپ اس کے لیے ملازمت مہیا کر رہے ہیں تو وہ فوراً معاوضے اور کام کے اوقات کا تناسب سوچنا شروع کر دے گا۔ وہ غالباً ایسی ملازمت بہتر سمجھے گا جہاں پیسہ نسبتاً زیادہ اور کام کم ہو گا۔

دعوت اختتام کے قریب ہے لیکن نراد چوہدری کے پرستار ابھی تک سوالات پوچھنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے جرات مندانہ نقطہ نظر کی تعریف کرتے ہیں اس کے سنکی انداز کو پسند کرتے ہیں وہ فرد فن ہے اس کے اندر ہمارے دوسرے بزرگ لیڈروں کی طرح معذرت خواہانہ انداز نہیں۔ وہ نوجوانوں سے گفتگو کے دوران ایسا شعلہ پیدا کرتا ہے جو جوانوں اور بزرگوں کی عمروں کے فرق کو مٹا دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کے تمام دوست تیس سال سے کم عمر کے ہیں اور جو لوگ اس سے بڑی عمر کے ہیں وہ اس کے دوست اس وقت بنے تھے جب ان کی عمریں تیس سال سے کم تھیں ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے۔

ایک لحاظ سے نوجوان نسل نراد چوہدری پر رشک کرتی ہے۔ نراد چوہدری ناراض نوجوان نسل کے افراد میں ناراض بوڑھا آدمی ہے۔ اگلے روز میں اس سے ملنے اس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں دہلی کے پرانے شہر کی دیواروں کے ساتھ کشمیری دروازے پر پہنچتا ہوں۔ "تم میری کھڑکی میں سے جمنوں کا شہر دیکھ سکتے ہو۔" وہ کہا کرتا تھا۔ میرا

خیال تھا کہ اس کا گھر دریا کے کنارے ہو گا۔ اس کی بجائے میں نے اپنے آپ کو غلیظ علاقے میں لوگوں سے گھرا ہوا پایا۔ غالباً میں غلط سمت میں آنکلا تھا۔

قریب ہی مجھے "پنجاب روڈ ویز" کا بورڈ نظر آیا۔ میں ایک سکھ سے جو قریب ہی ایک کار کی مرمت میں مصروف ہے نراد چوہدری کے بارے پوچھتا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سکھ اس نام سے واقف نہیں۔ پھر میں اسے بتاتا ہوں کہ وہ ایک مشہور لکھاری ہے اور اس کا حلیہ وغیرہ بتاتا ہوں — ایک کھسانی سی ہنسی اس کے چہرے پر آتی ہے "وہ بنگالی بابو — چھوٹا سا، سوکھا ہوا — ہاں ہاں — وہ سڑک کی دوسری جانب ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کرتا ہے —" اس کا نام جانی واکر ہے —" ایک شریر بچے کی آواز آتی ہے مجھے بعد میں پتہ چلا کہ نراد چوہدری کا نک نیم اس علاقے میں جانی واکر تھا۔

"کیا تم تھوڑا سا پنیر لینا پسند کرو گے۔ فرانس سے درآمد شدہ طیارے کے ذریعے یہ دو دن میں یہاں پہنچتا ہے لیکن تین دن کسٹم والے لگا دیتے ہیں۔ میرے پاس کچھ واد کا بھی ہے پولش واد کا — یہ روسی واد کا سے بہتر ہے —" وہ مجھے اپنے شراب خانے میں لے جاتا ہے۔ وہاں وائن، سپرٹ اور شراب کی بے شمار قسمیں ہیں وہ ایک بوتل اٹھاتا ہے — "شاتیو لاتور — دنیا کی بہترین شرابوں میں سے ایک — ۱۹۵۴ — ایک اچھا سال ہے۔"

وہ ایک خوبصورت گلاس میں واد کا انڈیلتا ہے۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ وہ ایک اور بوتل اٹھاتا ہے اپنی انگلی سے اس کا کاگ اڑاتا ہے اور اسے میرے کان کے قریب لاتا ہے — "سنو — کسی خالص آواز ہے —"

چھوٹا سا کمرہ کتابوں سے اٹا پڑا ہے۔ کچھ جرمن کتابیں بھی ہیں: "میں ایک دن میں صرف تین گھنٹے لکھنے میں گذارتا ہوں۔ باقی وقت میں پڑھنے، سیر کرنے یا موسیقی سننے میں گذارتا ہوں۔" میری نظر ایک بہت اعلیٰ اور قیمتی THORENS سیٹریو ریکارڈ پلیئر پر پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک قدیم لانگ پلے گراموفون بھی رکھا ہے۔

نوجوان کے علاوہ زیادہ لوگ مجھے ملنے نہیں آتے — یہ ایک غریب اور پسماندہ

علاقہ ہے اور شاید لوگ یہاں آتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر کے باہر اکثر اوقات بڑی بڑی C.D کاریں کھڑی ہوتی ہیں۔" وہ فخر سے کہتا ہے۔ "میں غیر ملکیوں سے زیادہ اچھی طرح مکس آپ ہوتا ہوں۔ ہندوستانی ان کی نسبت کم آبیز ہوتے ہیں۔" اس کے یہ ریمارکس میری سانس بند کرنے کے لیے کافی تھے اسے بلاشبہ امارت پرستی کہا جا سکتا ہے لیکن امارت پسند تو ایسے گفتگو نہیں کرتے۔

قریب ہی شادی کا ایک دعوت نامہ رکھا ہے۔ وہ محسوس کر لیتا ہے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ "میں یہ صرف وصول کرتا ہوں۔ میں وہاں جاتا نہیں۔ شادی کے موقع پر ہزاروں کارڈ تقسیم کرنا ایک قسم کا احمقانہ کام ہے لوگ ان مہمانوں کے آگے خوراک ایسے پھینکتے ہیں جیسے کتوں کے آگے۔ اور پھر امیر، بااثر اور غریب مہمانوں میں تمیز روا رکھنا اس سے بھی بدتر بات ہے۔"

کیا ہمارے راہنما اس قسم کی باتوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہے۔" میں پوچھتا ہوں

"کیا تم جانتے ہو کہ دعوت نامے میں اصل مضمون کیا ہوتا ہے۔ فلاں فلاں بلا رہا ہے اور بریکٹ میں کچھ وفاقی وزیر بھی متوقع ہیں۔"

"اگرچہ ہم اپنے آپ کو روحانی کہتے ہیں لیکن کیا ہم سب سے بڑھ کر عدم تحفظ کے شکار نہیں۔" میں پوچھتا ہوں۔

ہندوستانی قوم بہت بری طرح عدم تحفظ کی سوچ کا شکار ہے۔ تم کرائے کے مکان میں کیوں رہتے ہو۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ لیکن میں کرائے کی دنیا میں رہتا ہوں میں جواب دیتا ہوں۔ ہندوستانی لوگوں کا روحانیات سے کوئی تعلق نہیں روئے زمین پر ان سے زیادہ مادہ پرست اور کوئی نہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں حتیٰ کہ سنسکرت میں بھی روحانیات کے لیے کوئی لفظ نہیں۔ کیا تمہیں پتہ ہے۔ ہم نے ایک لفظ "ادھیاتمک" گھڑ لیا لیکن وہ بھی انگریزوں کے آنے پر۔

وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہندوستان صدیوں تک افراتفری اور بدامنی کا شکار رہا ہے اگر کبھی تھوڑی دیر کے لیے امن کا دور آیا بھی تو لوگوں نے یہی سوچا کہ کسی نہ کسی طریقے

سے مال بنایا جائے معلوم نہیں یہ اچھا دور کب تک رہے۔ ایک اور وجہ بھی ہے۔ قوت کی کمی۔ جن لوگوں کے پاس زیادہ قوت نہیں انہیں اپنے تحفظ کی خاطر اٹھنا پڑتا ہے کیا کبھی کوئی شیر بھی اپنی غذا کے بارے میں فکرمند ہوا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ جب چاہے شکار کر کے غذا حاصل کر سکتا ہے۔ ایسا اعتماد کسی بھی ہندوستانی کے نصیب میں نہیں"

"اگر ہم اتنے ہی مادہ پرست ہیں تو پھر مغرب کے بعض لوگ بھارت میں کشش کیوں محسوس کرتے ہیں۔" میں پوچھتا ہوں

"انیسویں صدی میں سب سے پہلے جرمنوں نے ہندوستان کو ایک روحانی قوم سمجھنے کی غلطی کی۔ یہی خیال مغرب کی دنیا میں چھایا ہوا ہے۔ مغربی اقوام اپنی اقدار کھو چکی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ یہاں سے کچھ حاصل کر سکیں گی۔ جب وہ یہاں آتے ہیں تو حقیقت حال دیکھ کر حیران پریشان واپس چلے جاتے ہیں۔ ہمیشہ آپ کو پڑی سے اترے ہوئے لوگ سکون تلاش کرتے ہوئے نظر آئیں گے کچھ نشہ آور چیزوں کے لیے آتے ہیں اور کچھ جنسی آسودگی کی تلاش میں جو کہ ہندوستان میں وجود ہی نہیں رکھتی ہندوستان سیکس کے لحاظ سے دنیا کا گندترین ملک ہے۔

"گویا ہمارے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔"

ہماری تہذیب کے پاس ضرور ہے۔ لیکن ہمارے پاس نہیں۔ کتنے ہندوستانی اپنی تہذیب کے بارے میں جانتے ہیں۔ کتنے افراد اپنی زبان خود پڑھ اور جان سکتے ہیں۔ میں اس ہندوستانی سے نفرت کرتا ہوں۔ جو ہندوستان کو انگریزی زبان کے ذریعے جانتا ہے۔"

"ہندوستان کے روحانی پیشواؤں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ مثلاً مہارشی اور تو ری کے شنکراچاریہ جی۔"!

اگر میں اندرا گاندھی کی جگہ پر ہوتا تو ان دونوں کو پھانسی پر چڑھا دیتا در حقیقت وہ کاروباری لوگ ہیں۔ ہندو سادھو قوت کے متلاشی ہیں۔ وہ بادشاہوں کی مانند ہیں فوجیوں کی طرح غلبہ پانے کی مانند وہ ذہنوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے

مریدوں کی نجی زندگی پر بھی غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جب کوئی مرید اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے اور سادھو سے صلاح لیتا ہے تو یہی سادھو اکثر اوقات بنے بنائے رشتے توڑ دیتے ہیں۔ صرف اپنی قوت کا اظہار کرنے کے لیے ان میں سے تین چوتھائی تو اپنے مریدوں کی بیویوں پر بھی تصرف رکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مرید اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ تم ہندو مذہب کی اخلاق سوزی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"کیا یہ اخلاق سوزی جنسی محرومی کا نتیجہ نہیں ۔۔۔؟"

"جنسی پابندی ہندوستان کا نیا شاخسانہ ہے۔ پرانے اصول میں ہندوستانی معاشرہ اس پابندی سے آزاد تھا۔ عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں ہمیں نئی اقدار وضع کرنا ہوں گی۔ اعلیٰ ترین محبت کے پیچھے بھی لذت کا حصول پوشیدہ ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بہترین وائن میں زیادہ الکحل ہوتی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم پرانے دور کی طرف جا رہے ہیں جب ہم وائن پیتے ہیں تو الکحل نہیں پی رہے ہوتے۔ لیکن جو آدمی الکحل کا رسیا ہے وہ تیز ترین الکحل ہی پیے گا سیکس بھی ایسے ہی ہے جس آدمی کو قدرتی طریقے پر جنسی آسودگی میسر نہ ہو گی وہ کسی گھٹیا سے گھٹیا طوائف کے پاس جائے گا خواہ وہ آتشک کی مریض ہی کیوں نہ ہو۔

"نوجوان ادیبوں کو آپ کیا مشورہ دیں گے ۔۔۔؟"

"جس موضوع پر آپ لکھنا چاہیں اُسے تلاش کریں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ علم بہرحال محبت کا پھیلاؤ ہے پھر مکمل سنجیدگی اور خلوص سے لکھیں۔ ثانوی درجے کی تحریر ہرگز نہ لکھیں۔ اپنے تجربات کا اظہار کریں ۔۔۔"

"اگر انگریزی زبان میں لکھیں تو اس سے کوئی فرق پڑے گا۔"

"یقیناً۔۔ اگر انگریزی زبان میں لکھنا مقصود ہو تو ہرگز یہ نہ سوچیں کہ صرف ہندوستانیوں کے لیے لکھ رہے ہیں جتنی اچھی انگریزی ہو گی اتنی ہی بڑی مقبولیت ہو گی۔ ایک اور چیز جب تک کوئی ہندوستانی۔ یورپی غذا نہیں کھائے گا۔ اچھی انگریزی نہیں لکھ سکے گا۔ ہندوستانی خوراک اعصاب کو متاثر کرتی ہے اور ذہانت کمزور ہو جاتی ہے (میں

محفوظ ہوتا ہوں لیکن نراد چوہدری سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہے)"

"ہندوستانی طلباء کی بے چینی پر آپ کیا کہتے ہیں ۔۔"

"ہندوستانی طالب علم بغاوت پر آمادہ ہے۔ وہ ہر اس قدر کا دشمن ہے۔ جو اس کی بزرگ نسل اس پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ ہر باپ کی خواہش ہے کہ اس کی اولاد مکمل طور پر مادہ پرستانہ زندگی گذارے۔ بغاوت تو کرتے ہیں لیکن ان کے پاس اپنی کوئی مثبت اقدار نہیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں نااہلیت کی بنیاد پر کسی کو سزا نہیں دی جاتی اور کسی اہل کو انعام نہیں ملتا۔ اہل لوگ نااہل لوگوں کے لیے انشورنس پریمیم مہیا کرتے ہیں ۔۔"

وقت کم ہونے والا ہے نراد چوہدری نے صرف نصف گھنٹے کے لیے وقت دیا تھا لیکن ہماری بات چیت تقریباً تین گھنٹے چلی ہے۔ نراد چوہدری ابھی سب کچھ کہہ سکتا ہے واد کا نے مجھے تھوڑا سا مست کر دیا ہے۔ فرانسیسی پنیر کا ذائقہ ابھی تک تازہ ہے حالانکہ پنیر دن کسٹم کی تحویل میں رہا ہے۔

دروازے پر وہ مجھے اپنے جاپانی سٹائل کے درخت اور پودے دکھاتا ہے ان میں گیکٹس بھی ہے۔ نہایت خوبصورت۔ بہت سی عمدہ منی ایچر۔ وہ شفیق انداز میں کیکٹس پر جھکتا ہے۔ میں دونوں کی طرف باری باری دیکھتا ہوں۔ دونوں میں بے انتہا مشابہت ہے

معجزہ ساز — داداجی

میرا کوئی مذہب نہیں ۔ مجھے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔ مذہب عقل سے انکار ہے اور عقل میرے لیے عظیم ہے ۔ لیکن میں ان لوگوں کے خلاف نہیں ہوں جو مذہب سے پیوستہ ہیں کیونکہ مذہب ان میں سے کچھ کے مفاد میں بھی ہے میں معجزوں اور جادو پر یقین نہیں رکھتا ۔ لیکن یہ مانتا ہوں کہ کچھ نظریات ایسے ہیں جو سائنس دانوں کو بھی ششدر کر دیتے ہیں ۔ میں یہ سب کچھ آمیہ رائے چوہدری سے اپنی ملاقات کے ابتدائیے کے طور پر لکھ رہا ہوں ۔ آمیہ رائے چودھری جسے اس کے بہی خواہ "داداجی" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

مجھے داداجی کے بارے میں دو کتابیں ملیں ۔ ان کتابوں میں مشہور و معروف ڈاکٹروں ، پروفیسروں اور تاجروں کے خراج عقیدت تھے ۔ یہ سب داداجی کی کرامات سے متاثر تھے اور بذاتِ خود تجربہ کر چکے تھے ۔ میرا تجسس بیدار ہوا ۔ کچھ روز بعد فلم سٹار ابھی بھٹہ چاریہ میرے دفتر آیا اور مجھے داداجی سے ملانے لے گیا ۔ اس کے چہرے پر پھوٹتی خوشی کی لہروں نے مجھے شک میں ڈال دیا ۔ غالباً اس نے مجھے داداجی کے دھرم باسیوں (مریدوں) میں شمار کر لیا تھا ۔

میں واقعات کے اظہار میں کسی تعصب کو بروئے کار نہیں لاتا ۔ بندرا میں داداجی کے کمرہ استقبالیہ میں دیوان کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا اور وہ دیوان بھی غالباً داداجی کے لیے تھا اس وقت ۔ وہاں تقریباً آدھی درجن مرد اور عورت تھے سب کے سب بنگالی — داداجی اندر داخل ہوئے سب تعظیماً کھڑے ہو گئے ایک آدمی نے تو بڑھ کر اپنا سر داداجی کے پاؤں پر رکھ دیا ۔

داداجی لمبے قد اور نازک جلد کے مالک ہیں ۔ ان کے کالے گیسو دراز ہیں ان کی جوانوں والی خوبصورتی ان کی ستر سال کی عمر کو جھٹلا دیتی ہے ۔ جو کوئی بھی ان کو دیکھتا ہے ان کی ہپناٹزم کے اثر والی آنکھوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے پدما گندھا (لوٹس کی خوشبو) سارے کمرے کو معطر کر دیتی ہے

داداجی دیوان پر بیٹھ جاتے ہیں اور میری طرف متوجہ ہوئے ہیں میں اٹھتا ہوں اور ان کے قدموں کے پاس بیٹھ جاتا ہوں ۔ وہ مجھے بڑے مہربان لیکن مسخر کرنے کے انداز میں گھورتے ہیں ۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ میرے آنے کا مقصد کیا ہے میں بتاتا ہوں کہ میں کسی مذہب کا ماننے والا نہیں کسی روحانی شے کا وجود تسلیم نہیں کرتا اور داداجی اور ان کے پیروکاروں کا تجسس مجھے وہاں کھینچ لایا ہے ۔

"اگر سری سیتہ نارائن خود تم سے بات کرنا چاہیں تو —" وہ پوچھتے ہیں ، میں کچھ سمجھ نہیں پاتا ۔ "اگر وہ تمہیں کوئی نشانی بھیجیں تو —؟" وہ پھر پوچھتے ہیں وہ اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہیں جو خالی ہے لیکن میرے سامنے ہی اس پر ایک کانسی کا تمغہ نمودار ہوتا ہے جس پر ایک بزرگ کی شبیہ ہے ۔ "یہ سری سیتہ نارائن کی طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے —" داداجی کہتے ہیں "نہیں ایسا نہیں ہے —" میں احتجاج کرتا ہوں "داداجی — یہ آپ مجھے دے رہے ہیں —" وہ مسکراتے ہیں "میں کچھ بھی نہیں — یہ تمام کرامات سری سیتہ نارائن کی ہیں —"

تمہارا نام کیا ہے وہ پوچھتے ہیں ، میں بتاتا ہوں ۔ وہ تمغہ واپس لیتے ہیں انگوٹھے سے اس کی ایک طرف مسلتے ہیں ، جو طرف خالی تھی اب اس پر ایک نام کھدا ہے صرف میرے نام کے ہجے درست ہیں ۔ صرف ایک لمحے کے بعد داداجی کی ہتھیلی پر ایک سونے کی زنجیر نظر آتی ہے "اب یہ تمغہ تمہارے گلے میں پہنانے کے لیے ہے" وہ کہتے ہیں ۔ اور مجھے تھما دیتے ہیں ۔

"میرے ساتھ آؤ —" وہ مجھے اپنی خوابگاہ میں لے جاتے ہیں ۔ ایک دفعہ پھر ہم مختلف سطحوں پر ہیں ۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ جاتے ہیں اور میں فرش پر وہ مجھے

بتاتے ہیں کہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہیں سری ستیہ نارائن تمام کائنات پر چھائے ہیں۔ گرد کوئی نہیں ہیں۔ ہر آدمی اپنا گرد آپ ہے کیونکہ وہ سری ستیہ نارائن کا حصہ ہے۔ یاد رکھنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ "مہا نام" ۔۔ اور یہ کسی بھی زبان میں ہو سکتا ہے "تم اسے اپنی زبان میں معلوم کرنا چاہتے ہو۔۔؟" وہ مجھے کاغذ کا ایک خالی پرزہ پکڑاتے ہیں اور سری ستیہ نارائن کی تصویر کے سامنے جھکنے کے لیے کہتے ہیں میں ایسا ہی کرتا ہوں۔ کاغذ پر گورمکھی میں دو الفاظ ابھرتے ہیں گوپال گوبند ۔۔ ایک لمحے کے بعد کاغذ پھر سفید ہے۔ ظاہراً طور پر پیغام مل چکا ہے اور کاغذ پر تحریر کی ضرورت باقی نہیں۔ وہ میری داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اس میں سے پدما گندھا کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ایک دہریئے کے لیے یہ ایک سودمند تجربہ ہے لیکن اس سے میرے مذہب کو نہ ماننے اور معجزوں پر عدم یقین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ ہی میری عقل خدا کے بارے میں اس قسم کی شعبدہ بازیوں کو تسلیم کرتی ہے۔۔ گرد اور مہا نام (اسمِ اعظم) ہماری وحدتی کے فلسفے میں شامل ہے۔۔ لیکن میں قاری کو اس کے ذہن کی رسائی پر چھوڑتا ہوں۔

موم بتی کی روشنی اور داتا بل

اچانک بجلی فیل ہو جاتی ہے میں اپنے ہمسایوں کے ہاں پتہ کرتا ہوں۔ ان کی بجلی بالکل ٹھیک ہے میں واپس آکر مختلف سوئچ آن آف کرتا ہوں شاید کوئی خرابی نظر آئے۔ کلِاک کلاک، کلِک کلاک ۔۔ بجلی ندارد۔

شاید فیوز اُڑ گیا ہے۔ میں ہمیشہ سوئچ بکسوں سے خوفزدہ رہا ہوں اور سرکٹ شارٹ ہونے یا واٹرنگ یا فیوز لگانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں صرف فون کرکے مدد کے لئے پکار سکتا ہوں۔ لیکن اس طرح تو گھنٹوں صرف ہو جائیں گے میں ایک چھوٹی سی دُعا دہراتا ہوں بجلی کی روشنی کا دیوتا میری اس دعا کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ میں موم بتیوں کا وہ پیکٹ نکالتا ہوں جو ہند و پاک جنگ کے دوران خریدا تھا انہیں ایک خاص طریقے سے لگاتا ہوں اور جلاتا ہوں۔

کال بیل خاموش ہے اس لیے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ شاید زیلو کا مان گئے ہیں اور انہوں نے کسی کو مدد کے لیے بھیج دیا ہے ۔۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔ واہ ۔۔ حقیقتاً یہ ایک دیوتا سمان انسان ہے۔ کالے بالوں اور کالی داڑھی میں سے داتا بل کا زرد چہرہ پورے چاند کی طرح نمودار ہوتا ہے اس کا سیکرٹری اور میرا دوست اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوتا ہے۔

میں اس کی تاریکی اور بجلی فیل ہونے کی وجہ سے کمرے کے اندر کی گھٹن پر معافی مانگتا ہوں ۔۔ "فکر کی کوئی بات نہیں ۔۔" وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہتا ہے حقیقتاً میں بلب کی روشنی کی بجائے موم بتی کی روشنی زیادہ پسند کرتا ہوں ۔۔" میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آتا ہے۔ کیا بجلی کا فیل ہونا داتا بل کی مرضی سے تو نہیں ہے۔۔؟

وہ اکتیس سال کا نوجوان آدمی ہے زردی مائل جلد۔ لیکن گفتگو کا انداز اور اس کی آنکھوں کی قوت ظاہر کرتی ہے کہ اس کے اندر کتنی توانائی موجود ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ سیشن جج کا بیٹا ہے اور لیڈز یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اپنا کمرہ ترچھا کرتا ہے اور کہتا ہے "تم مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔"

ہاں پوچھنا تو بہت کچھ ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں کئی بار کی سنی ہوئی باتیں ہی سن سکوں گا۔ بہتر ہے کہ آج بات جیت تمہارے بارے ہی ہو۔ تم اس راستے پر یعنی روحانیت کے راستے پر کیسے آئے۔"؟

روحانیت — سپرچوایلزم۔ مجھے اس کا پہلا تجربہ تین سال کی عمر میں ہوا میں نے اندر وسعت کی ایک عجیب حس بیدار ہوتے ہوئے دیکھی۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو۔"

ادن ہوں — وسعت سے کیا مراد۔"؟

"وسعت سے مراد، پھیلنا ہے۔ بڑا ہونے کا احساس۔" وہ وضاحت کرتا ہے — اپنے دونوں بازوں کو پھیلاتا ہے — بالکل اس طرح جس طرح سینہ بڑا کرنے کے لیے لوگ ورزش کرتے ہیں —" کیا اب بات سمجھ پائے ہو۔"؟

نہیں — تاہم تم بتاؤ ہوا کیا — تم نے کیا محسوس کیا۔"؟

"میں نے دریافت کیا کہ میرے اندر واقعات کو پہلے سے دیکھ لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ کیا سمجھے۔"؟

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ کیا سمجھے یا سمجھ گئے ہو اس کا تکیہ کلام ہے اور گفتگو کے دوران وہ ان کا بے تحاشا استعمال کرتا ہے۔

"مجھے کوئی مثال دو — میں مطالبہ کرتا ہوں۔"

بہتر — تو سنو — جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میں نے ایک رات خواب میں ایک سانپ دیکھا جو بوتل میں بند تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے رہائی پانے کی درخواست کر رہا ہو۔ اگلے روز جب میں کالج کی لیبارٹری میں گیا تو میں نے دیکھا کہ

ایک جار میں سانپ موجود تھا جو کوئی شخص تجربات کے لیے سائنس کے استاد کے لیے لایا تھا میں نے اس شخص سے اس سانپ کو آزاد کرنے کے لیے کہا۔ وہ ایسا کرتے ہوئے بہت ہچکچا رہا تھا۔ مراٹھی میں ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ زخمی سانپ زندہ چھوڑ کر آپ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جس نے اس شخص کو مجبور کیا اور اس نے سانپ کو آزاد کر دیا۔ اب تم بتاؤ تمہارا اس واقع کے بارے میں کیا خیال ہے۔"؟

"ہو سکتا ہے اتفاقاً ایسا ہوا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے واقعہ ہوا ہو اور بعد میں خواب آیا ہو لیکن تم بھول چکے ہو۔" میں نے کہا داتا بل میرے اس نظریے پر ناخوش نظر آتا ہے۔" پیش بینی سائنسی طریقے سے ثابت کی جا سکتی ہے ماضی حال مستقبل سب ایک جاری عمل کا نام ہے۔ اگر تم ماضی کے بارے میں علم رکھتے ہو تو پھر مستقبل کے بارے میں بھی جان سکتے ہو۔" وہ آئن سٹائن کے الفاظ دہراتا ہے۔ وہ گوردوشیف اور آس پن سکائی کے نظریات کا حوالہ دیتا ہے۔ کیا سمجھے۔"!

نہیں میں اس طریقے سے سائنسی توجیح نہیں مانتا۔ سائنسی توجیحات صوفیانہ باتوں پر نہیں ٹھونسی جا سکتیں۔ بالکل آئن سٹائن سے چھلانگ لگا کر آس پن سکائی پر پہنچنا مناسب نہیں۔"

گوردوشیف آسپنسکائی کی نسبت زیادہ قرین قیاس ہے لیکن پیش بینی کی ممکنات تو نوسٹراڈومز کی پیش گوئیوں سے بھی ثابت ہوتی ہیں۔"

"اور ہمارا اپنا بھرگو سامت بھی تو — داتا بل کا سیکرٹری ڈیسائی مداخلت کرتا ہے" میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ یہ نوسٹراڈومز یہ بھرگو سامت سب فضول بکواس ہے اور اگر اسے ہی تم سائنسی طریقہ کہتے ہو تو پھر میرے لیے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں —" میں کہتا ہوں۔

داتا بل موضوع تبدیل کر دیتا ہے۔" کیا تم ٹیلی کائی نے سس پر یقین رکھتے ہو۔" پھر وہ میری طرف دیکھتا ہے کہ میں اس لفظ کا مطلب بھی سمجھا ہوں یا نہیں پھر وہ میری مدد کرتا ہے۔" یہ چیزوں کو اپنی قوت ارادی سے ایک جگہ سے

دوسری جگہ حرکت دے سکتا ہوں۔"

"مسمریزم کے ماہر بھی لوگوں کی حرکت پر قابو پاتے رہتے ہیں۔"

"میں جواب دیتا ہوں صرف انسانوں پر نہیں۔ میں بے جان چیزوں کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تم کولہاپور آؤ تو میں اس کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔" داتا بل کہتا ہے۔

"کولہاپور کیوں۔ یہاں کیوں نہیں۔؟" میں اعتراض کرتا ہوں داتا بل وضاحت کرتا ہے کہ ایسے واقعات کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اپنی اور کمالات کا اظہار کرنے کے لیے تیار ہے وہ مکمل تین منٹ کے لیے اپنی سانس روک سکتا ہے۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے میں بڑا لطف ہے۔ وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ اور اسے دیکھ کر مجھے کولن ولسن کا آؤٹ سائڈر یاد آجاتا ہے۔ سائنس، روحانیت اور فلسفے کا مجموعہ

"میں سادھو، سوامی یا ستیاسی ہرگز نہیں ہوں۔" وہ کہتا ہے۔ "میرے لیے ایسا بننا مشکل نہیں۔ ایک وقت میں لاکھوں افراد میری بات سننے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ میں کوئی دیوتا نہیں بننا چاہتا۔ میری شناخت اگر روحانیت کے فلاسفر کی حیثیت سے ہو تو یہی بہت ہے۔ میں محبت کی قوت کا سبق دیتا ہوں۔ میں خورد و نوش کے اصول وضع نہیں کرتا۔"

"لیکن تم تجرد کے قائل ہو اور جنسی تعلقات سے یکسر دستبردار ہونے پر یقین رکھتے ہو"

"ہاں ایسا ہے لیکن اس کی وضاحت میں پھر کسی موقع پر کروں گا۔"

میرا خیال ہے کہ داتا بل سے میری گفتگو اب کسی روز زیادہ طول پکڑے گی اور جیسا کہ ان طویل ملاقاتوں میں ہوتا ہے۔ ایک موضوع سے کئی اور موضوعات جنم لیتے ہیں۔ سیکس سے تجرد کی طرف۔

مرارجی ڈیسائی

اس وقت مرارجی ڈیسائی کی عمر اکیاسی برس ہے۔ شکستہ، تھکا ہوا اور کسی قدر منتشر ذہن کا مالک۔ لیکن کچھ دنوں سے وہ مسلسل گفتگو اور سفر میں مصروف ہے میں اس سے بمبئی ایئرپورٹ پر مل سکا۔ جب وہ بھوج سے واپس آیا تھا۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ میری طرف چلا آیا۔ وہ میرے ہفت روزہ پرچے کے بارے میں فکر مند تھا اور مجھے گر کی کچھ باتیں بتانا چاہتا تھا۔ شاید اس نے محسوس کیا کہ سنجے گاندھی کو "بھارت کا اس سال کا مرد آہن" لکھ کر میں نے اپنے پڑھنے والوں کو مایوس کیا ہے۔ میں نے احتجاج کیا اور وعدہ کیا کہ اسے تمام خطوط دکھاؤں گا۔ میرا خیال نہیں کہ وہ مجھے انٹرویو کے لیے وقت دے۔ لیکن اس نے کہا "ساڑھے پانچ بجے آجاؤ لیکن میرے انٹرویو میں بعد میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونا چاہیے۔"

مرارجی بھائی کی بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق نہیں۔ لیکن میں اس کی وطن دوستی کا ہر حال میں قائل ہوں وہ آپ کو جھاڑ تو پلا سکتا ہے (جیسا کہ اس نے مجھے پلائی) لیکن اس کی نیت کبھی بری نہیں ہوتی۔ اور اندرا گاندھی ہی کی مانند وہ وقت کا بے پناہ پابند ہے۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے دوسرے ملاقاتیوں کو باہر نکال دیا گیا اور مجھے اندر بلایا گیا۔ اس وقت وہ اپنی عمر سے بیس سال چھوٹا لگ رہا تھا گرمجوش اور دوستانہ۔ اس کی گفتگو انتہائی شرافت پر مبنی ہوئی اور وہ کبھی الفاظ کو ضائع نہ کرتا۔

س: ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کی شب جب آپ کی گرفتاری عمل میں آئی تو آپ نے کیا محسوس کیا۔؟"

ج :۔ یہ میرے لئے اچانک نہیں تھا۔ کم از کم دو سال سے اور زیادہ تر ۱۹۷۴ء سے مجھے اس کا احساس تھا کہ کوئی ایسا قدم اٹھنے والا ہے اسی لیے میں نے دو دفعہ بھوک ہڑتال کی تاکہ لوگوں کو بیدار کیا جا سکے۔ یہ قربانی ہی ہے جو لوگوں کو یاد رہتی ہے

س :۔ ایمرجنسی کے دوران کتنے لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔

ج :۔ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق ڈیڑھ لاکھ کچھ کے خیال میں ایک لاکھ ۵ ہزار لیکن ایک لاکھ سے کم کسی صورت میں بھی نہیں۔

س :۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد صرف بارہ ہزار ہے۔؟

ج :۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ صرف اٹھارہ ہزار افراد تو مدھیہ پردیش کی حکومت نے گرفتار کیے اور یہ بات ان کے گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔

س :۔ گرفتاری کے دوران آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔؟

ج :۔ میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا گیا۔ نہ ہی وہ بُرا سلوک کر سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

س :۔ ریڈیو اور اخبار سے دُور تو رکھا جا سکتا تھا۔؟

ج :۔ پہلے دو تین روز تو ہمیں کوئی اخبار مہیا نہیں کیا گیا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ اخبار یا ریڈیو میرے نزدیک خوراک سے زیادہ اہم ہیں اور اگر آئندہ دو روز میں یہ چیزیں مہیا نہ کی گئیں تو میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔ دنیا میں یا ملک میں کیا ہو رہا ہے اس کی خبر کے بغیر زندگی کیسے ممکن ہے۔ میں نے تحریری درخواست نہیں دی تھی بلکہ ایک افسر کو زبانی بتا دیا تھا اور پھر اگلے ہی روز مجھے اخبار مل گئے۔

س :۔ انیس ماہ کی قید کے بعد آپ میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ کیوں؟

ج :۔ میں بھگوان پر یقین رکھتا ہوں اس لیے میرے اندر تلخی پیدا نہیں ہو سکتی۔ میں بھگوان اور اس کے اصولوں پر یقین رکھتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قانونِ فطرت کے برعکس کچھ ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ میری گرفتاری بھی یہاں تک کہ وزیر اعظم کا عہدہ بھی قانونِ فطرت کے خلاف برقرار نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ تمام واقعات

اس ترتیب سے ہوتے ہیں کہ نتیجتاً بہتر صورت سامنے آجاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ناتیغاندڑ جیسی موذی بیماری آپ کی صحت بہتر بنا دیتی ہے کیونکہ آپ اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ اگر جدوجہد نہ کریں تو پھر موت یقینی ہے۔

اگر میری قید قانونِ فطرت کے خلاف ہوتی تو مسز اندرا گاندھی مجھے جیل نہیں بھیج سکتی تھیں۔ اگر آپ میں ایمان ہے تو آپ ہر چیز کا مقابلہ آسانی سے کر سکتے ہیں کیا آپ یقین کریں گے کہ قید کے دوران میں بالکل صحیح و سالم رہا حالانکہ میں قیدِ تنہائی میں تھا۔ اور سب کم لوگ قیدِ تنہائی برداشت کر سکتے ہیں ایک شخص اکیلا رہ کر پاگل ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھا۔ خدا ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔

س :۔ کیا آپ اتنے اہم لیڈر تھے کہ آپ کو سب سے آخر میں رہا کیا گیا۔؟

ج :۔ یقیناً میں آخری آدمی تھا جو رہا ہوا۔ اس لئے کہ میں نے کبھی موجودہ پابندیوں کے سامنے سر خم نہیں کیا۔ اگر میں جیل سے نکل آتا اور الیکشن اناؤنس نہ ہوتے اور ایمرجنسی لگی رہتی تو میں خاموش نہ بیٹھتا۔ میں اس کے خلاف بیان دیتا اور پھر جیل میں ہوتا۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا۔ اگر میں اکیلا ہی احتجاج کرنے والا ہوتا تو بھی میں ضرور کرتا۔ اسی لیے انہوں نے مجھے اس وقت رہا کیا جب انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا لیکن یہ میرا اپنا اندازہ ہے اور یہی درست وجہ بھی ہے۔

س :۔ آپ کے خیال میں مسز گاندھی کی طرف سے انتخابات کا اس موقع پر اعلان کرنا کیا معنی رکھتا ہے یہ انتخابات ایک سال پہلے یا بعد میں بھی ہو سکتے تھے۔

ج :۔ مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسز گاندھی کو یہ محسوس ہو گا ہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی بے چینی، ان کی اپنی پارٹی کے اندر اختلافات، مایوسی اور بدامنی دن بدن ان کے انتخاب جیتنے کے مواقع کم کر رہی ہے۔

جبری خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام سے بہت سے لوگ نالاں ہیں یقیناً وہ اس کے بارے میں جانتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اب وہ اسے رضاکارانہ طور پر کروانے کے

احکامات دے چکی ہیں اور اس سلسلے میں طاقت کا استعمال ختم کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت جبر کیا گیا تھا دہلی اور مظفر گڑھ میں کئی افراد کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا لیکن اس کا ذکر کبھی اخبار میں نہیں آیا۔

میں اس سے اس لئے واقف تھا کہ میری قید کے دوران بھی ایسا ہوا۔ لوگ بسوں سے باہر گھسیٹے گئے اور ان کی نس بندی کر دی گئی۔ اس کے بعد کئی دنوں تک بسیں خالی دوڑا گئیں۔ لوگ خوفزدہ تھے اور ان میں سفر نہیں کرتے ہیں اسی احتجاج اور غم و غصے کو دیکھتے ہوئے مسز گاندھی نے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا کیونکہ اس کے بعد وہ منتخب ہونے کے سلسلے میں قطعی طور پر ناامید تھیں اگرچہ وہ یہی کہتی رہیں کہ وہ جمہوریت پر یقین رکھتی ہیں اس لیے انتخابات کروا رہی ہیں۔

س: آپ کے خیال میں انتخاب سے پہلے زیادہ اہم مسائل کیا ہیں

ج: ہم نے انہیں اپنے منشور میں تفصیل سے لکھا ہے۔

س: آپ نے لکھا ہے جمہوریت بمقابلہ ڈکٹیٹرشپ

ج: نہیں میرا کہنا ہے جمہوریت بمقابلہ جمہوریت کا نقصان۔ کیونکہ کسی نہ کسی کمزور ترین شکل میں جمہوریت تو ضرور موجود ہے۔ اصل میں اسے نقصان بہت پہنچا ہے اور زیادہ نقصان جبری نس بندی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب کسی وقت بھی ڈکٹیٹرشپ کی توقع ہو سکتی ہے۔ آئین میں ایمرجنسی کی ترامیم کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور ایمرجنسی لگانے کے بغیر بھی جبر مسلط کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی سب سے بڑا خطرہ ہے۔

دوسرا بڑا مسئلہ خوف کا ہے ہمیں خوف کے تدارک کے لیے کام کرنا چاہیے اس خوف نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے مجھے ہر جگہ خوف نظر آیا ہے۔ ۱۸ جنوری کے بعد حالت ذرا بہتر نظر آتی ہے۔ اگرچہ ایمرجنسی اٹھائی نہیں گئی لیکن اسے نرم کیا گیا ہے اور وزیراعظم نے آزادانہ انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا ہے ہر کوئی لوگوں پر اپنا نقطۂ نظر واضح کر سکے گا اس لیے اب لوگ کسی حد تک دہشت سے باہر آ چکے ہیں۔

اسی طرح پریس کی پابندیاں بھی نرم ہوئی ہیں۔ انتخابات کے اعلان کے بعد

سٹیٹسمین اور انڈین ایکسپریس نے ہمیں کافی کوریج دی ہے۔ (یہ اخبار ایمرجنسی کے دوران بھی خود مختار تھے) لیکن ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا کی سرکولیشن خاصی متاثر ہوئی ہے اب یہ اخبار بھی حزب اختلاف کے نظریات کو جگہ دینے لگے ہیں۔ اس سے بھی ہمارا حوصلہ کچھ بلند ہوا ہے لیکن یہ تمام مسائل نہیں ہیں۔

آئین کی بحالی کے لیے بہت سی بنیادی باتیں اہم ہیں۔ ہمیں اس بات کی ضمانت دینا ہو گی کہ اس قسم کی ایمرجنسی دوبارہ نہیں مسلط کی جائے گی کوئی حکومت ایسا نہیں کرے گی۔ پھر ہم حکومت کے ترقیاتی منصوبوں پر غور کریں گے کیا وہ گاندھی کے نظریات کے مطابق ہیں، یعنی گاؤں خوش حال ہیں۔ اور اگر گاؤں خوش حال ہیں تو شہر اپنے آپ خوش حال ہوں گے۔ آج شہروں میں تعفن ہے۔ اور گاؤں ٹوٹ رہے ہیں دیہاتوں میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔

ہم مغرب کی طرح صنعت کی ترقی نہیں چاہتے۔ بہت سی چیزیں مشترک ہو سکتی ہیں۔ بڑی صنعتیں ضرور ہونی چاہئیں۔ لیکن جہاں ان کی گنجائش نہیں وہاں چھوٹی صنعتیں ضرور ہونی چاہئیں تاکہ دیہات کے لوگ پوری طرح روزگار حاصل کر سکیں ہم نے اپنے منشور میں اس سارے کام کے لیے دس سال کا عرصہ رکھا ہے۔

ایک اور بڑا مسئلہ بدعنوانی کا ہے۔ اس کے بارے میں کمیشن تشکیل دیے جائیں گے۔ اب دیکھیں کہ لوک پال بل گذشتہ چھ سال سے التوا میں پڑا ہے اگر ہم اقتدار میں آ گئے تو سب سے پہلے اس بل کو منظور کروائیں گے اس بل کی دفعات سے وزیر اعلیٰ اور وزیراعظم بھی مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ اگر کوئی شکایت موصول ہوئی تو اس کے احتساب سے کوئی بھی مبرا نہیں ہو گا صرف اور صرف اسی طریقے سے بدعنوانی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

س: یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس بات کا اعتماد ہے کہ انتخابات آزاد اور منصفانہ ہوں گے۔ اس اعتماد کا پس منظر ہے؟

ج: میں مطمئن ہوں کیونکہ سابقہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہم ایسی صورت حال سے نمٹنے کے

قابل ہیں اور میرے خیال میں ہمیں وزیر اعظم کے بیانات پر بداعتمادی نہیں کرنی چاہیے مگر گاندھی نے کہا ہے کہ انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوں گے تو ہم اس وقت تک یقین کریں گے جب تک کہ اس کے برعکس ثابت نہ ہو۔

س:۔ کیا آپ سماچار، دُوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے کردار سے مطمئن ہیں؟

ج:۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا لیکن اب انہوں نے حزب اختلاف کو کوریج دینی شروع کی ہے لیکن پھر بھی وہ حکومت کی خبریں زیادہ نشر کرتے ہیں۔ وہ جانبدار ہیں اور جہاں تک سماچار کا تعلق ہے تو وہ تو ایک آزاد نیوز ایجنسی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے درمیان صاف ستھرا مقابلہ ہے اور خود مختار ہیں۔ آئی اے ایس کا ایک فرد سماچار کا مینجنگ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا ہے ان حالات میں سماچار کو آزاد ایجنسی کیسے کہا جا سکتا ہے اسی بات پر ذہن مقدر ہوتا ہے۔ اس سے حکومت یا حکمران پارٹی کی نیک نیتی کمزور ثابت ہوتی ہے

س:۔ کمپنی کے عطیات پر پابندی کے بارے میں آپ کا ردعمل کیا ہے؟

ج:۔ اس سے عطیات نہ دینے کے بل پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا اگر آپ ہو بھی گیا تو ہمیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

س:۔ لیکن بہت سی کمپنیوں کو آپ سے ہمدردی ہے۔

ج:۔ وہ تو ہے لیکن اگر وہ ہمیں کوئی عطیہ دیں گی بھی تو وہ خود تباہ ہو جائیں گی اب بھی بہت سے کانگریس کے ممبر (پولیس، افسرانِ اعلیٰ ایم پی اے یا ایم این اے کے علاوہ) لوگوں کو دھمکا رہے ہیں کہ ۲۲ مارچ کے بعد وہ ان سے نمٹ لیں گے میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ دہلی میں ایک پرنٹنگ پریس ہے۔ اس کے مالکان ہمارے ہمدردوں میں تھے ان میں سے ایک نے مجھے فون پر بتایا کہ انہیں اپوزیشن کی مدد کرنے سے روک دیا گیا ہے انہیں بتایا گیا کہ MISA ابھی ہٹائی نہیں گئی۔ ایمرجنسی ابھی برقرار ہے اور تمہارے ساتھ بعد میں نمٹا جائے گا۔ مالکوں نے پوچھا کہ وہ اب کیا کریں تو میں نے کہا کہ اگر وہ خوف زدہ ہیں تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی نصیحت کر سکتا تھا کہ اگر وہ ہماری مدد کرنے سے خوف زدہ ہیں تو پھر کسی کی بھی

مدد نہ کریں۔ لیکن اگر ہم تمہیں کوئی چیز شائع کرنے کے لیے دیں تو وہ ضرور شائع کرو اور ایسا بھی نہ کر سکو تو اللہ حافظ۔

انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا ہے اور اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔ میں لوگوں کو ڈرانا نہیں چاہتا بلکہ میں ان کے اندر موجود خوف ختم کرنا چاہتا ہوں۔

س:۔ بابو جگ جیون رام کے استعفیٰ کا کیا ردعمل تھا۔ انہوں نے پہلے ہی استعفیٰ کیوں نہ دیا؟

ج:۔ جگ جیون رام نے پہلے ہی مستعفی نہ ہونے کی وجہ بتائی تھی۔ اگر وہ پہلے ہی ایسا کر لیتا تو جیل میں ہوتا اور انتخابات نہ ہوتے۔

س:۔ کیا آپ اس وضاحت سے مطمئن ہیں۔

ج:۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں نے اُسے نکلنے کو نہیں کہا تھا لیکن اس کا کانگریس چھوڑ دینے کا فیصلہ پہلے ہی سے معلوم تھا۔

س:۔ چون صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج:۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

س:۔ آپ کا کیا خیال ہے وہ کانگریس چھوڑ دے گا۔

ج:۔ میرا خیال ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔

س:۔ جگ جیون کا کابینہ اور کانگریس چھوڑنے کا کیا اثر مرتب ہوگا؟

ج:۔ جگ جیون بابو کا کانگریس چھوڑنے کا فیصلہ ہر پختون اور نیچی جات کے دوسرے لوگوں پر بڑا اثر ہوگا۔ کیونکہ اس ملک میں قربانی یا تیاگ کی بڑی قدر ہے اور ایسا عمل اپنا اثر ضرور چھوڑتا ہے۔

س:۔ کانگریس، جمہوریت کی خاطر جنتا پارٹی میں کیوں شامل نہیں ہوئی۔

ج:۔ نظریاتی اختلافات تو کوئی نہیں ہیں وہ بھی گاندھی جی کے نظریات کے پیروکار ہیں لیکن دوسرے اختلافات بھی ایسے نہیں کہ ہم لڑتے بیٹھ جائیں بنیادی اختلافات تو

ہرگز نہیں طریقہ کار کے بارے میں الگ نظریات ہیں جن پر غور کیا جاسکتا ہے

س: مسز گاندھی کا خیال ہے کہ جنتا پارٹی، پارٹیوں کی جوں جوں کا مربہ ہے اور ان میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ نہ ہی ان کا کوئی پروگرام ہے۔؟

ج: وزیراعظم ایسا کہہ سکتی ہیں۔ آپ نے ہمارا منشور دیکھا ہے۔ آخر لوگوں نے یونہی تو ہمارے پروگرام پر صاد نہیں کیا۔ ہم کمیونزم کے خلاف ہیں، ملک تقسیم کرنے کے خلاف ہیں اور عدم تشدد کے حامی ہیں اور گاندھی جی کے نظریات پر عمل پیرا ہیں۔

س: کمیونسٹوں سے آپ کی "الرجی" معلوم ہوتے ہوئے حیرانی کی بات ہے کہ CPM آپ کے ساتھ اتحاد میں شامل ہے۔؟

ج: تم کہتے ہو کہ مجھے کمیونزم سے الرجی ہے۔ مجھے کسی سے بھی کوئی الرجی نہیں۔ مسٹر خشونت سنگھ تم مجھ سے الرجک ہو سکتے ہو کیونکہ میں شراب نوشی نہیں کرتا، میں تم سے یا دیگر پینے والوں سے الرجک نہیں ہوں۔ میں تو صرف اتنا کہتا ہوں کہ جس طرح بیرونی نظریات معاشرے کے لیے نقصان دہ ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی نقصان دہ ہیں اور انہیں ایسے کاموں سے روکنا چاہیئے۔ بصورت دیگر قوانین تعزیرات ہند بیکار ہو جائیں گی۔

تاہم جنتا پارٹی کے اتحاد پر گفتگو کی طرف لوٹتے ہوئے میں یہ سوچتا ہوں کہ کوئی سہ رکنی مقابلہ نہیں۔ اس طرح تو منتخب ہونے والی حکومت اقلیت کی حکومت بنے گی اور یہ ہم نہیں چاہتے۔

س: DMK کے ساتھ آپ کا اتحاد بھی انہیں بنیادوں پر ہے۔ DMK تو اپنی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے۔

ج: نہیں وہ اس بات سے انکار کر چکے ہیں جب تک انہوں نے واضح الفاظ میں یہ اعلان نہیں کیا تھا وزیراعظم ان کی ساتھی تھیں اب چونکہ انہوں نے اعلان کر دیا ہے اس لیے مجھے ان پر اعتماد ہے بصورت دیگر ہمارا ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہوتا۔ اگر CPM بھی جمہوریت کی حمایت نہ کرتی تو ان کے ساتھ بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ لیکن یہ صرف انتخابی اتحاد ہے اور بس۔

س: اس کا مطلب ہے کہ یہ اتحاد صرف مسز گاندھی کو اقتدار سے ہٹانے کے لیئے ہے۔؟

ج: ہرگز نہیں۔ ہم برسر اقتدار پارٹی کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ اندرا کو نہیں ہمیں مسز گاندھی سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں لیکن چونکہ وزیراعظم پارٹی کا کرنا دھرتا ہوتا ہے اس لیے حزب اختلاف اسی کی بات کرتی ہے اور یہ سب پر عیاں ہے۔

س: س کے پٹیل کے اس بیان پر آپ کیا کہیں گے جس میں اس نے کہا ہے کہ آپ کی جماعت میں اندرونی انتشار ہے۔ اور اس کے ساتھ اور اس کی جماعت BPCC کے ساتھ غلط رویہ رکھا گیا ہے۔

ج: کسی قسم کا کوئی انتشار نہیں۔ آراء کا اختلاف تو ایک فطری بات ہے۔ کیا ایسا اختلاف حکمران جماعت میں نہیں ؟ امیدواروں کے چناؤ میں ایسا ہوتا ہے۔ اگر ایک ہی حلقے میں دس موزوں افراد ہیں تو آپ کس کس کا اطمینان کریں گے۔ بالآخر وہ کمیٹی ہی فیصلہ کر سکتی ہے جو اس مقصد کے لیے تشکیل دی گئی ہے ہو سکتا ہے اس کے بعد لوگوں کے حقیقی اختلافات ہو جائیں۔ لیکن اگر کسی کے دل میں وطن کی حقیقی محبت ہے تو پھر اسے خود غرضی چھوڑنی چاہیئے۔ اسے جماعت کی مدد کرنا چاہیئے اور اسے کمزور نہیں بنانا چاہیئے۔

دوسرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایس کے پاٹل نے کوئی قابل اعتراض بات نہیں کی اس نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا ہے۔ اور پارٹی کی مدد کی ہے۔ اس نے ہر ایک سے درخواست کی ہے کہ پارٹی کو مضبوط بنایا جائے "تاکہ موجودہ حکومت کا خاتمہ کیا جا سکے مجھے اس کے اور کسی بیان کا علم نہیں۔

س: اس نے انتشار کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔

ج: اس کی اپنی پارٹی یا ذات کے خلاف انتشار ہو تو ہو اور تو کہیں انتشار نظر نہیں آتا ہم نے شامل جماعتوں کو سیٹوں کی الاٹمنٹ تو نہیں کی۔ اس لیے یہ درست نہیں کہ BPCC کوئی قرارداد پاس کرے۔ وہ منتخب ہونے والے امیدواروں کا فیصلہ

نہیں کر سکتے۔ یہ بات تو کمیٹی پر منحصر ہے کہ وہ کسے مقرر کرتی ہے اور مسٹر پٹیل اس کمیٹی کا رکن تھا۔ اب اگر وہ اس کمیٹی کو مطمئن نہیں کر سکا تو پھر بیان بازی کیا معنی رکھتی ہے کمیٹیوں پر بہر حال اعتماد کرنا ضروری ہوتا ہے ہم ایک شخصی جماعت تو نہیں ہیں چیئرمین کا یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کو باہر نکال دے۔ اختلاف رائے کی صورت میں سنٹرل کمیٹی با اختیار ادارہ ہے چیئرمین نہیں۔ ہم ایسے فرد کی خواہش نہیں رکھتے جس کی آواز تنہا ہو بلکہ ہم اجتماعی آواز کے حامی ہیں۔ لیکن کسی ایک آدمی کا نقطہ نظر کمیٹی کے لیے یا سب کو اکٹھا رکھنے کے لیے سود مند بھی ہو سکتا ہے۔

س: مختلف ریاستوں میں آپ کی جماعت کی کامیابی کے کیا مواقع ہیں۔

ج: ہر ریاست کے بارے میں حتمی طور پر کہنا تو مشکل ہے لیکن ہر ریاست میں نظر آنے والا جوش و جذبہ بڑا پر امید ہے۔ میں نے ایسا جذبہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ جدوجہد آزادی کی تحریک میں بھی نہیں۔ لوگوں کے بڑے بڑے مجمعے محض تماشہ دیکھنے کے لیے نہیں۔ لوگ بڑے منظم ہیں۔ اور بڑے دھیان سے اور غور سے بات سنتے ہیں جلسہ گاہ میں مکمل خاموشی سے ہماری گفتگو سنتے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم خاصی اکثریت سے کامیاب ہوں گے۔

س: مسز گاندھی کا خیال ہے کہ آپ کی پارٹی کی حکومت مستحکم نہیں ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

ج: کیا یہ درست ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ہم واضح اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا وہ اکثریت حاصل کر لیں۔ میں ممکنات سے انکار نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر مسز گاندھی مستحکم حکومت بنا سکتی ہیں تو ہم بھی بنا سکتے ہیں اور کیا ان کی حکومت مستحکم ہے؟ ذرا دیکھئے کہ ان کی اپنی جماعت کے اندر کیا ہو رہا ہے لوگ پارٹی کیوں چھوڑ رہے ہیں اور صورت حال اتنی اطمینان بخش کیوں نہیں۔ ان کی پارٹی تو دوسری پارٹیوں کا مجموعہ نہیں۔ کیا کانگریس دوسری کسی بھی پارٹی سے زیادہ چوں چوں کا مربہ نہیں۔

ہم کوئی گئی گذری جماعت نہیں۔ اگر ہم میں کوئی اختلافات تھے بھی تو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں ختم سمجھیں اور گاندھی جی کے راستے پر چلیں اور جونہی انتخابات ہو جائیں گے ہم فروعی اختلافات ختم کر کے ایک پارٹی بھی بن جائیں گے۔ ہم نے اس کا اعلان کر دیا ہے۔ اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کتنی جلدی ایسا کرنا ممکن ہے۔

س: آپ نے کہا تھا کہ اندرا گاندھی ہی صرف پارٹی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اپوزیشن نے انہیں اس قابل بنایا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک جماعت ہیں۔ آپ کا کیا تبصرہ ہے۔

ج: ہم انہیں انڈیا تو نہیں کہتے۔ یہ مرحوم کامراج کا بیان تھا جن کے ساتھ انہوں نے گٹھ جوڑ کرنا چاہا تھا۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ حکمران جماعت کو ہٹائیں گے۔ یہ تو مسٹر بروہا کا بیان ہے کہ "مسز گاندھی بھارت ہیں" ہمیں الزام مت دیں یہ تو وہ خود یا ان کی جماعت ہے جو انہیں بھارت کی پہچان ثابت کر رہی ہے۔ ہمیں اندرا گاندھی کی حیثیت سے ان کے ساتھ کوئی اختلاف ہیں ہاں وزیر اعظم کی حیثیت سے ضرور ہے۔

س: کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ مسٹر سنجے گاندھی کانگریس کو کمیونسٹوں سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ج: میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن کچھ ریاستوں میں اب بھی کمیونسٹ کانگریس کے ساتھ ہیں۔

س: گویا جس طرح آپ کے اتحاد میں دوسری پارٹیاں ہیں۔

ج: ان کا CPI یعنی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ساتھ تو پکا معاہدہ ہے۔ صرف انتخابی رشتہ نہیں مثلاً وہ کیرالا میں کیا کر رہے ہیں۔ کیا وہ مل کر انتخاب نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہم CPM کے ساتھ اس طرح انتخاب نہیں لڑ رہے۔ ہم صرف ان کے لیے سیٹیں چھوڑ رہے ہیں اور وہ ہمارے لیے۔ ہم ایک دوسرے کی خاطر کام نہیں کر رہے ہیں جنتا پارٹی اکثریت حاصل کر کے حکومت بنا لیتی ہے تو CPM اس کا حصہ نہیں ہو گی۔

س:۔ کیا یہ درست ہے کہ سنجے گاندھی حکومت کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں اور کانگریس پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

ج:۔ مجھے بتایا گیا تھا اور میں نے اخباروں میں بھی پڑھا ہے وہ جہاں بھی جاتا ہے پولیس کا بڑا انتظام ہوتا ہے اس کے پاس بڑی بڑی کارپوریشنوں کی اجارہ داری ہے حتیٰ کہ جہاز تک خریدنے کے سلسلے میں وہ خود مختار ہے اور میرے خیال میں اس کا ذاتی طیارہ بھی ہے۔ اس سب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

سنجے گاندھی کا حق ہے کہ وہ انتخاب میں کھڑا ہو۔ وزیراعظم کا بیٹا ہونا اس کا یہ حق باطل نہیں کرتا۔ لیکن کسی کو حکومتی مشینری استعمال کرنے کی اجازت نہیں خواہ وہ وزیراعظم ہی کیوں نہ ہو۔ جب جنتا پارٹی برسراقتدار آئے گی تو انگلستان، جرمنی اور دیگر ممالک کی طرح کسی سرکاری آدمی کو انتخابات کے لیے سرکاری مشینری استعمال نہیں کرنے دے گی۔

س:۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب آپ بمبئی کے وزیراعلیٰ تھے تو آپ بھی بڑے خود مختار تھے۔۔ کیا ایسا تھا۔۔؟

ج:۔ کیا آپ کوئی ایسا واقعہ بیان کر سکتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ وزیراعلیٰ کی حیثیت سے میں نے ناجائز فائدہ حاصل کیا ہو۔

س:۔ میں یہاں نہیں تھا۔

ج:۔ تو پھر دوسروں سے پوچھئے کہ کوئی ایک مثال ہی پیش کریں۔

س:۔ بمبئی میں پریس کانفرنس کے دوران آپ نے کہا تھا کہ آپ ٹائمز آف انڈیا کے خلاف ہو گئے تھے جب آپ وزیراعلیٰ تھے۔ کیا یہ پریس کی آزادی کے خلاف بات نہیں اور کیا اس سے آپ کا خود مختار ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔

ج:۔ میں نے اخبار کو اس کے نظریات کی سزا نہیں دے رہا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ اور ہندوستان میں اس کی بے انتہا عزت و توقیر ہے۔ میرا ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں حالانکہ وہ ہماری بجائے دوسروں کا ساتھ دیتا ہے میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پریس مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیئے۔ اور حکومت اسے

متاثر نہ کرے۔ لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ حکومت زرد صحافت کی پشت پناہی نہ کرے اس وقت ٹائمز آف انڈیا، زرد صحافت کی طرف مائل تھا اور کئی دوسرے پرچوں مثلاً BLITZ کی مانند ذاتیات پر اتر آیا تھا اس لیے میں نے انہیں ذاتی حملے کرنے سے روکا تھا۔ ان کے جنرل مینجر نے جواہر لال نہرو کو شکایت کی لیکن پنڈت جی نے میری طرف داری کی اور کہا "تم ایسا کیوں نہیں کہتے کہ اخبار کے نرخ زیادہ ہیں اس لیے تم نے اشتہار بند کر دیئے ہیں۔۔" میں نے انہیں جواب دیا کہ میں ایسی جھوٹی بات نہیں کر سکتا جونہی وہ ذاتیات کی پالیسی چھوڑ دیں گے میں انہیں سرکاری اشتہارات دینا شروع کر دوں گا۔ اور پھر یہ اشتہارات ان کے مطالبے کے بغیر ہی انہیں دے دیئے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کے کارکنوں میں کچھ مسائل پیدا ہو گئے انہوں نے میری مدد چاہی تو میں نے ان کی مدد کی۔ کیونکہ میں اس ادارے کے خلاف نہیں تھا اس کے بعد مسٹر فرینک موریس میرے پاس آیا اس کا جنرل مینجر جے۔ سی۔ جین کے ساتھ مقدمہ چل رہا تھا میں مسٹر موریس کے حق میں تھا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں پریس کے خلاف تھا میں آخری آدمی ہوں گا جو ایسا کروں گا۔

س:۔ آپ خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں رائج طریقوں کے خلاف ہیں اور رضا کارانہ طریقوں کے حق میں ہیں۔ کیا یہ حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔

ج:۔ یہ غلط ہے کہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے حق میں ہوں بالکل گاندھی جی کی طرح۔ لیکن ایسا کرنے والے لاکھوں میں دو تین ہی ہوں گے۔ اس لیے عوام الناس کی دوسرے طریقوں سے مدد کرنا چاہیئے اور حکومت ایسا کر سکتی ہے لیکن یہ بالجبر نہیں ہونا چاہیئے

آج کل لوگوں کی جبری نس بندی کی جا رہی ہے۔ لوگوں کو بسوں سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے اور ان کی نس بندی کر دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بوڑھے لوگ بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں ایک ایسا شخص بھی اس ظلم کا شکار ہوا جس کی شادی کو ابھی صرف چند ماہ ہوئے تھے اسے بھی بس سے اتار لیا گیا اور اس کی نس بندی کر دی گئی۔

س: یہ سب افواہیں ہیں   ۔ کیا ان کی تصدیق ہوئی ہے ۔؟

ج: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ افواہیں نہیں ہیں۔ لوگوں کو قتل کیا گیا ہے میرے پاس مثالیں موجود ہیں۔ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں لیکن میں اس کا نام نہیں لے سکتا کیونکہ اس کی نوکری جانے کا خطرہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی بیوی ایک بچے کو جنم دینے والی ہے اس کے بعد وہ بیوی کی نس بندی کروائے گا لیکن اسے کہا گیا کہ اگر وہ خود ابھی نس بندی نہ کروائے گا تو اس کی تنخواہ بند کر دی جائے گی چھ ماہ تک اسے ایک پائی نہیں ملی بالآخر اسے نس بندی کروانا پڑی۔ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ پولیس نے لوگوں کو مارا پیٹا اور مجبور کیا۔ یہ کام ان طریقوں سے نہیں کیے جاتے۔

اب حکومت کو احساس ہوا ہے۔ کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اور اب ہی انہوں نے منشور میں یہ کہا ہے کہ آئندہ   کیا جائے گا۔ میں مانتا ہوں کہ آبادی میں اضافے پر کنٹرول کرنا چاہیئے لیکن یہ مقصد اس وقت زیادہ بہتر طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے جب لوگ خوشحال ہوں۔ کہ آپ دیکھیں گے کہ غریب لوگوں کے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور امیروں کے ہاں کم۔ جونہی لوگوں کے لیے اچھی ملازمت اچھا ماحول اور بہتر تعلیم مہیا کی جائے گی وہ خود بخود اس طرف مائل ہوں گے۔

س: کیا جنتا پارٹی کامیابی کے بعد آپ کو وزیر اعظم چن لے گی۔

ج: میں کچھ نہیں کہہ سکتا یہ تو منتخب شدہ ممبران پر منحصر ہے۔

س: لیکن آپ تو پارٹی لیڈر ہیں۔

ج: میں پارٹی کا چیئرمین بھی ہو سکتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ممبران پر اپنا اثر و رسوخ ڈالوں گا۔ اگر مجھ سے کہا جائے تو یہ الگ بات ہے لیکن میں خود اس کے لیے جوڑ توڑ نہیں کروں گا۔ میں نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی اور نہ ہی اب ہے۔ میں اقتدار کی خاطر جنتا پارٹی میں نہیں آیا۔ میں نے زندگی بھر کبھی عہدوں کی خواہش نہیں کی۔ یہ خود بخود میرے پاس چلے آئے ہیں۔

س: برسر اقتدار آنے کے بعد کیا آپ ایمرجنسی کے دوران ہونے والے واقعات

کی تحقیق کروائیں گے یا بعض لوگوں کے خلاف الزامات کی تصدیق کروائیں گے؟

ج: بہت نمایاں چیزوں کی تحقیق و تفتیش ضرور ہو گی مثلاً بدعنوانی۔

س: کس کی ۔؟

ج: مثلاً یونین منسٹر، مارچ میں ۱۲۵ ارکان پارلیمنٹ نے اس کے خلاف تحریری شکایت کی تھی لیکن یہ شکایت ایک طرف پھینک دی گئی اور ابھی تک اس پر کچھ نہیں ہوا۔ DMK کو دیکھ لیں۔ تامل ناڈو کا پہلا گورنر DMK کی تعریف کرتے نہیں تھکتا تھا۔ اچانک ہی وہ بدعنوان ہو گئے ہیں اور ان کے خلاف ایک کمشن تشکیل دیا گیا ہے۔ لیکن یونین منسٹر کے خلاف کوئی کمیشن نہیں بنایا گیا۔

اسی طرح جب تک کانگریس اکالیوں کے ساتھ تھی۔ ہر چیز ٹھیک تھی۔ لیکن جونہی انہوں نے ساتھ چھوڑا مرکزی حکومت نے ان کے خلاف ایک کمیشن مقرر کر دیا لیکن انہوں نے ابھی تک یونین منسٹر کے خلاف کوئی کمیشن نہیں مقرر کیا۔ کیا یہ درست اقدام ہے۔

سنجے گاندھی

بے شمار سوالوں سے مسلح میں اس سے ملنے گیا۔ یہ انٹرویو کوئی خاص کامیاب نہیں رہا۔ اُس نے کئی سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ راز اُگلنے والی شخصیت ایک صحافی کے لئے بہت موزوں ہوتی ہے۔ لیکن خاموش اور کم گو شخص تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کی سوانح حیات لکھنے والا بھی عذاب میں مبتلا ہو گا۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ جو انسان اپنے الفاظ میں وزن رکھتا ہے، اس شخص سے زیادہ متاثر کرتا ہے، جو ہوا میں باتیں کرتا ہے۔

وہ درمیانے قد، صاف رنگت اور چھدرے جسم کا مالک ہے۔ اس کی آنکھیں گہری، تیز اور ایمانداری کا تاثر لئے ہیں۔ ایک کمزور سی مسکراہٹ ہمیشہ اس کے لبوں پر ہوتی ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ناراض ہے یا خوش۔ اُسے بات پسند آئی ہے یا بور ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ صاف لفظوں میں گفتگو کرتا ہے۔ شرمیلا پن لئے لیکن اپنے الفاظ کے استعمال میں بڑا محتاط۔ پیشانی سے پیچھے ہٹے ہوئے بالوں کے باوجود وہ ایک خوبصورت جوان ہے۔

سوال:۔ آپ نے سیاست میں دلچسپی لینا کب شروع کیا؟ میں نے پہلا سوال پوچھا۔

جواب:۔ صحیح طور پر تو یاد نہیں، کہ کب۔ لیکن میں جس ماحول میں پروان چڑھا، اس میں سیاست میں حصہ نہ لینا ناممکن ہوتا۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کے دوران ہوا میں ہاتھ لہرائے۔ اُس سے گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا، کہ اس کے باپ فیروز گاندھی، اس کے دادا جواہر لعل اور اس کے پڑدادا موتی لعل کی ارواح نزدیک ہی موجود ہیں۔ ساتھ کے کمرے سے ایک نسوانی آواز کبھی کبھار آجاتی تھی، اور میرا خیال ہے، کہ یہ آواز اس کی ماں مسز اندرا گاندھی کی آواز ہے۔ مجھے احساس ہوا، کہ یہ سوال پوچھنا حماقت تھی، کیونکہ سنجے گاندھی نے سیاست، دودھ کی بوتل کے ساتھ ہی گھونٹ گھونٹ پینا شروع کر دی ہوگی۔ میں نے اپنے سوال کی شکل تبدیل کی۔

سوال:۔ میرا مطلب ہے، کہ آپ نے کب یہ محسوس کیا، کہ ہمارے ملک کے سیاستدان کیسے ہیں اُن کے درمیان کیا اختلافات ہیں، اور وہ کیا چاہتے ہیں؟

جواب:۔ اس نے بغیر کسی تلخی کے جواب دیا:۔ میں اُنہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ کافی عرصے سے انہوں نے مارو‌تی کی بنا پر مجھے نشانہ بنا رکھا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح باقی باتیں بھی مجھے معلوم ہو گئیں۔ اخبار اور لوگوں کی زبان۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ اگلوا سکا۔

سوال:۔ کیا آپ کو اپنے نانا یاد ہیں۔ کیونکہ جب ۱۹۶۳ میں وہ چل بسے تو آپ کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی؟

جواب:۔ اُس نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا، نانا ۱۹۶۳ میں نہیں، بلکہ ۱۹۶۴ میں فوت ہوئے تھے۔ اس وقت میری عمر سترہ سال تھی۔ مجھے وہ اچھی طرح یاد ہیں۔

سوال:۔ کیا آپ اُن سے بے تکلف تھے؟

جواب:۔ بالکل ایسے ہی جیسے دوسرے لوگ اپنے نانا یا دادا سے ہوتے ہیں۔

سوال:۔ کیا وہ آپ کی سوچ پر کسی طریقے سے اثر انداز ہوئے؟

جواب:۔ میں کوئی خاص طریقہ تو نہیں بتا سکتا۔

سوال:۔ اور آپ کی اپنے باپ سے بے تکلفی؟

جواب:۔ بالکل — ہر باپ اور بیٹے کی طرح۔

سوال:۔ کیا انہوں نے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گذارا — تعلیم میں آپ کی مدد کی؟

جواب:۔ ہاں — اسباق کے دوران وہ میری مدد کرتے رہے۔

سوال:۔ میرا خیال ہے، یہی سلسلہ آپ کے بھائی اور والدہ کا بھی ہے؟

جواب:۔ یقیناً — جو رشتہ دوسرے لوگوں کا اپنے بھائیوں یا ماں سے ہوتا ہے، وہی میرا ہے۔

میں اس کی خاندانی زندگی میں نقب لگانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے موضوع تبدیل کر دیا۔

سوال:۔ کیا مذہبی طور پر آپ کی تعلیم ہُوئی۔ آپ مذہب کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب:۔ میں باقاعدہ طور مذہبی شخص نہیں ہُوں۔ لیکن میں مذہب کے خلاف نہیں ہُوں۔ میں سمجھتا ہُوں کہ ہر کسی کو کوئی مذہب ماننے یا نہ ماننے کا اختیار حاصل ہے۔

سوال:۔ کیا کسی خاص کتاب نے آپ کو متاثر کیا؟

جواب:۔ میں کسی ایک کا نام نہیں لے سکتا۔

سوال:۔ شاعری، ناول، تاریخ، سوانح ۔ کس شعبے سے زیادہ آپ کو دلچسپی ہے؟

جواب:۔ کسی سے بھی نہیں ۔ وہ مسکرایا۔ میرے مطالعے کے میدان اور ہیں۔

سوال:۔ ٹیکنیکل یا انجینئرنگ وغیرہ کی کتب؟

جواب:۔ ہاں ۔ بالکل اسی طرح کی۔

سوال:۔ آپ فیکٹری میں کتنا وقت دیتے ہیں؟

جواب:۔ تقریباً ہر روز صبح ساڑھے نو بجے سے ایک بجے تک۔ اُس نے کہا، اور ان افواہوں کی تردید کی، کہ اس کا بھائی راجیو فیکٹری کی نگہداشت کر رہا ہے۔ یا یہ کہ فیکٹری برلا فیملی کے پاس چلی گئی ہے۔ لیکن سیاسی اور سماجی کاموں میں اس کا زیادہ وقت گزر رہا ہے۔ اور اگر حالات بدستور رہے، تو سنجے گاندھی صفحۂ ارض پر زیادہ سیاست کار کے طور پر اُبھرے گا۔

سوال:۔ کیا آپ پارلیمنٹ میں شامل ہونے کی کوشش میں ہیں؟

جواب:۔ کیسے؟ وہ تھوڑا سا پریشان دکھائی دیا۔

سوال:۔ راجیہ سبھا کے ذریعے ۔ میں نے اندازہ لگایا۔

جواب:۔ ہرگز نہیں۔

سوال:۔ لوک سبھا؟

جواب:۔ وہ کیسے؟

سوال:۔ ضمنی انتخابات کے ذریعے۔

جواب:۔ ہرگز نہیں۔

سوال:۔ تو پھر عام انتخابات میں۔

اُس نے محسوس کیا، کہ میں اُسے سیاسی بیان دینے کی طرف مائل کر رہا ہُوں۔ وہ مسکرایا اور خاموش رہا۔ میں نے کہا تھا، کہ اس کا انٹرویو لینا نہایت مشکل ہے۔ میں نے ایک بار پھر موضوع تبدیل کیا۔

سوال:۔ مانٹریال میں ہماری مایوس کن کارکردگی پر آپ کا کیا ردِ عمل ہے، یا کہ آپ کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں؟

جواب:۔ مجھے کھیلوں میں دلچسپی ہے۔ سکول کے زمانے میں باکسنگ اور پیراکی کا شوقین تھا۔ مجھے ہاکی میں شکست کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ لیکن میرا خیال ہے، کہ اگر ہمارے یہاں سے کچھ پہلوان وہاں جاتے، تو شائد ایک دو تمغے لے آتے۔ میں نے پہلوانوں کو ملک سے باہر بھیجنے کی بات کی تھی۔ لیکن مجھے بتایا گیا، کہ وہ پہلے ہی ناکام ہو کر آ چکے ہیں۔ اُس نے کندھے اُچکائے اور مسکرانے لگا۔

سوال:۔ میرے خیال میں آپ سُرخ فیتے کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آپ نے دہلی سے بلند شہر تک ایک ماہ میں سڑک بنوائی ہے؟

جواب:۔ میں نے نہیں، حکومت نے بنوائی ہے۔ اُس نے مداخلت کی۔

سوال:۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں تو ایسے منصوبوں کی کاغذی کارروائی بھی مکمل نہیں ہوتی۔ سُنا ہے کہ آپ ایک بہت بڑی قوت کی مانند اس کے پیچھے تھے۔

جواب:۔ لوگ ایسا سوچتے ہوں گے۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے مایوس کیا۔ مگر میں نے حملہ جاری رکھا۔

سوال:۔ میں نے سُنا ہے، کہ سیر و سیاحت کی وزارت میں بہت سے کام التوا میں پڑے تھے۔ اور وہ آپ کی پ کے باعث جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ کیا ایسا ہُوا ہے۔ اور اگر ایسا ہُوا ہے، تو کیا

آپ باقی مسائل میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔

جواب:۔ بہت سی جگہوں پر کام ہو رہا ہے۔ دہلی میں پچھلے دو ماہ یعنی مئی اور جون میں دو سو بیس سے تین سو کلو میٹر سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں۔ تیس کالونیوں میں بھی سڑکیں بنی ہیں۔ جہاں وہ لوگ شفٹ ہوئے ہیں، جنہیں کچی بستی علاقوں سے نکالا گیا تھا۔ اب ان کالونیوں میں ساڑھے سات لاکھ کے قریب لوگ رہ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دہلی کے ترقیاتی ادارے نے کیا ہے۔

سوال:۔ لوگوں کا خیال ہے، کہ حکومت کے کاموں میں آپ کی مداخلت ہے۔ آپ اس الزام پر کیا کہیں گے؟

جواب:۔ ناراض ہونے کی بجائے اس نے آرام سے کہا۔ میں اس کی تردید کرتا ہوں۔ میں کسی جگہ بھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کر رہا۔

سوال:۔ ایسے ہی لوگوں کا کہنا ہے، کہ اس پراپیگنڈے کی وجہ سے آپ کے ان اچھے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ اور اب آپ نے دلچسپی لینی چھوڑ دی ہے؟

جواب:۔ وہ ایک بار پھر پُرسکون تھا۔ وہ مسکرایا۔ میں جو کام پہلے کر رہا تھا، وہی کر رہا ہوں، اور ایسی باتیں مجھے پریشان نہیں کرتیں۔

سوال:۔ آپ پارٹی میں کوئی عہدہ کیوں نہیں لے لیتے، تاکہ پارٹی کی کارکردگی بہتر ہو سکے؟

جواب:۔ میں پہلے ہی ایک پارٹی کا عہدے دار ہوں۔ میں یوتھ کانگریس کی نیشنل کونسل کا رکن ہوں۔

سوال:۔ پارٹی کی ایگزیکٹو میں کوئی اعلیٰ عہدہ کیوں نہیں؟

جواب:۔ میں اپنے کام میں مگن اور چُست ہوں۔ میں زیادہ بڑی ذمہ داری نہیں نبھا سکتا۔

سوال:۔ آپ نے حال ہی میں کہا تھا، کہ بزرگ لوگوں کو نوجوانوں کو راستہ دینا چاہیئے؟

جواب:۔ میں نے ایسا نہیں کہا۔ میں نے کہا تھا، کہ بزرگوں کو چاہیئے، کہ اگر نوجوان آگے آ رہے ہیں، تو ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اُن کے راستے میں کھڑے نہ ہوں۔

سوال:۔ حکومت میں، یا پارٹی میں؟

جواب:۔ میں کانگریس کے ریفرنس سے بات کر رہا تھا۔ کسی خاص شخص یا تنظیم کی بات نہیں تھی۔ دراصل میں یہی چاہتا ہوں، کہ بوڑھی نسل نوجوان نسل کی حوصلہ افزائی کرے۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو رہا۔ وہ نوجوانوں سے لاتعلق ہیں۔ اور سوچتے ہیں، کہ اگر کوئی اپنی لڑائی خود لڑ کر آگے آتا ہے، تو بے شک آئے۔

سوال:۔ آپ کانگریس کی صدارت کے لئے مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟

جواب:۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ یہ مضحکہ خیز ہے۔ سوال میری دلچسپی کا بھی تو ہے۔

سوال:۔ کیا آپ کانگریس کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟ کیا اس کی تنظیم نو کی ضرورت نہیں۔

جواب:۔ کیوں نہیں۔ جیسا کہ میں نے بھٹنڈہ میں کہا تھا۔ کانگریس کو تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ آپ ہندوستان میں جہاں کہیں بھی چلے جائیں، یوتھ کانگریس کو کانگریس کی نسبت زیادہ فعال پائیں گے۔ حالانکہ اس سے اُلٹ ہونا چاہیئے۔ کانگریس کو زیادہ فعال اور یوتھ کانگریس کو اس کے پیچھے ہونا چاہیئے۔

سوال:۔ آپ آگے آ کر اس کے لئے کچھ کیوں نہیں کرتے؟

جواب:۔ یوتھ کانگریس کی ذمہ داری ہی میرے لئے بہت ہے۔

سوال:۔ کانگریس کی مشینری ایسا کیوں نہیں کر رہی؟

جواب:۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس کا جواب کانگریس کے صدر سے معلوم کریں۔ میں یوتھ کانگریس میں ہوں، اور اس کے ارکان کانگریس سے مختلف ہیں۔

سوال:۔ مجموعی طور پر کانگریس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب:۔ یہ کانگریس کے صدر کے سوچنے کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، کہ ہم انتہا پسند لوگوں کو یوتھ کانگریس میں نہیں آنے دیں گے۔ بہت سے انتہا پسند آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری ممبر شپ لاکھوں لوگوں تک ہے۔ اس لئے ہم ہر آدمی کی تفتیش و تحقیق نہیں کر سکتے۔ جو کوئی رُکن بننا چاہتا ہے، بنا ہے۔ لیکن ہمارے عہدے داروں میں کوئی انتہا پسند نہیں ہے۔

سوال:۔ دُور دراز علاقوں مثلاً مہاراشٹر، تامل ناڈو اور بنگال میں یوتھ کانگریس کی پہنچ ہے؟

جواب:۔ آہستہ آہستہ ہر جگہ پر رُکنیت ہو رہی ہے۔ مہاراشٹر میں تو اس کی حالت بہت اچھی ہے۔ بہت سے علاقوں میں یوتھ کانگریس کے اراکین نے پانی محفوظ کرنے کے لئے بند اور ٹینک بنائے ہیں۔ سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ تامل ناڈو میں یوتھ کانگریس کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اس کے ابتدائی اثرات بہت اچھے ہیں۔ ابھی انتظار کریں گے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ بنگال میں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ تمام علاقے میں سیاسی ماحول ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کام سے زیادہ سیاست کا عمل دخل ہے۔ لیکن یوتھ کانگریس نے کچھ سماجی کام شروع کر رکھے ہیں۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑی بات ہے۔ ہم اچھے کارکنوں کی جماعت ہیں۔

سوال:۔ آپ کے ایک بیان کے مطابق جو کہ آپ نے "سورج" کو دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ پارٹی میں انتہا پسند بائیں بازو کا قبضہ ہے۔ جس کی لوگوں کو تشویش ہے۔ لیکن بعد میں آپ نے اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ میں نے کسی چیز کے بارے میں اپنے نظریات میں تبدیلی نہیں کی۔

سوال:۔ کیا آپ نے پارٹی کے لئے سرقوم اکٹھی کرنے میں اصلاحات کی ہیں؟

جواب:۔ میں نے کبھی اس کے بارے نہیں سوچا اور نہ ہی اب کرنے کی سوچ رہا ہوں۔

سوال:۔ کانگریس میں بائیں بازو کے حامی اور کمیونسٹ اس بات سے نالاں ہیں، کہ آپ اپنی سیاسی سوچ کو کوئی لیبل نہیں دے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر سیاست میں کام نہیں ہو سکتا؟

جواب:۔ یوتھ کانگریس بغیر کسی "ازم" کے اپنا کام بخیر و خوبی نبھا رہی ہے۔

سوال:۔ قومیانے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:۔ کس چیز کو قومیانے میں؟ کیا قیمتوں میں اضافے کے لئے۔ ہمارا مقصد کیا ہے؟ کیا ہمارا مقصد ہر حالت میں کم قیمتیں نہیں ہونا چاہیئے؟ اور اگر ایسا ہے، تو پھر کوئی بھی طریقہ ہو، مقصد حاصل ہونا چاہیئے۔ اگر قومیائے جانے سے ایسا ہو سکتا ہے، تو میں اس کی حمایت کرتا ہوں۔ بغیر کسی لوگوں

کی حالت سدھارنے کے لئے جو بھی طریقہ اپنایا جائے، میں اس میں شامل ہوں۔

میں نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

سوال:۔ آئین میں مجوزہ ترامیم کے متعلق آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

جواب:۔ میں آئین کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔

سوال:۔ کیا آپ کے خیال میں کسی تبدیلی سے پہلے ریفرنڈم ہونا چاہیئے؟

جواب:۔ میرے خیال میں ریفرنڈم کی ضرورت نہیں۔ ایک عام آدمی جو قوانین کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو، اس کی رائے اتنی اہم نہیں۔ میری مثال لیجئے۔ میں قانون کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔ میں کوئی واضح تجویز پیش کر سکتا ہوں، لیکن زیادہ گہرائی میں نہیں جا سکتا۔ یہ تو کسی ماہر کا کام ہے۔

سوال:۔ کیا کسی کمیٹی کی تشکیل ضروری نہیں، جو تمام پارٹیوں کی طرف سے تبدیلیوں کے بارے نمائندگی کرے؟

جواب:۔ اگر پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت حق میں ہو، تو پھر فرق نہیں پڑتا، کہ پارٹیاں زیادہ ہوں یا ایک ہی پارٹی کا فیصلہ ہو۔ ہر حالت میں اپوزیشن سے بات ضروری ہے۔

سوال:۔ آئینی ماہرین سے رائے لینے میں کیا مضائقہ ہے؟

جواب:۔ یہ تو اس پر منحصر ہے، کہ وہ آئینی ماہرین کون ہیں۔ ماہرین میں سے کچھ تو اتنے جانبدار ہیں، کہ ان کی رائے نہیں لی جا سکتی۔ اور اگر کوئی سچے ماہرین نکل بھی آئیں، تو ان کے پیروکاروں کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ تو پھر ان کی رائے یا مدد کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ یہی حال اپوزیشن کا ہے۔ تاہم ہر طبقے سے رائے لینی چاہئیے۔

سوال:۔ کیا آپ نے "السٹریٹڈ ویکلی" میں اس بحث پر مضمون پڑھا ہے؟

جواب:۔ ہاں، میں نے سرسری نظر سے دیکھا تھا۔

سوال:۔ صدارتی نظام حکومت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ نظام بہتر نہیں؟

جواب:۔ ذاتی طور پر میں اس کے حق میں ہوں، کیونکہ یہ بھارت کے مفاد میں ہے۔ لیکن اگر آپ بالغرض فرانس کا نظام اپناتے ہیں، اور پھر اسے بند کر دیتے ہیں، یا التوا میں ڈال دیتے ہیں، یا

بندوق کی نالی پر رکھ دیتے ہیں، تو اس سے فائدہ؟ اس میں اپنے حالات کے مطابق ترمیم کی ضرورت ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں، کہ کیا کیا تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ کیونکہ یہ مضمون میرے علم سے باہر ہے۔

سوال:۔ کیا ہمارے لئے صدارتی نظامِ حکومت کی طرف گامزن ہونا ممکن ہے؟

جواب:۔ نہیں۔

سوال:۔ آپ حال ہی میں سوویت روس سے ہو کر آئے ہیں۔ آپ کا ردِ عمل؟

جواب:۔ ہمارا استقبال بڑی گرمجوشی سے ہوا ہے۔

سوال:۔ مختلف شعبوں میں ان کی ترقی کی کیا سطح ہے؟

جواب:۔ روس کے شہر بہت ترقی یافتہ ہیں۔ بعض شعبوں میں ان کی ترقی نمایاں ہیں، بعض میں کم۔ ہاؤسنگ اور ہیوی انڈسٹری میں زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ انہوں نے کئی بڑے شہر بھی بسائے ہیں۔ لیکن سڑکیں بنانے میں وہ کمزور واقع ہوئے ہیں۔ وہ اس میدان میں ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ اگرچہ ان کا علاقہ ہم سے کہیں زیادہ ہے، لیکن وہ ہم سے کہیں پیچھے ہیں۔

سوال:۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ یہ تو منصوبہ بندی کے مختلف نظریات کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے۔ بھارت ہم سڑکوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، وہ کم۔ میں ذاتی طور پر سڑکوں کی تعمیر اہم سمجھتا ہوں۔ میں روس کے حالات کے بارے میں نہیں جانتا۔ اس لئے مجھے اُن کے حالات کا علم نہیں۔ اُنہوں نے اپنے شہروں اور قصبوں میں فاصلے سڑکوں کی نسبت ہوائی رابطے سے کم کئے ہیں۔

سوال:۔ جس طرح آپ نے درخت بچاؤ سکیم شروع کی ہے۔ کیا اسی طرح شکار پر مکمل پابندی لگا کر آپ پرندوں کا تحفظ نہیں کر سکتے؟

جواب:۔ میں مکمل طور پر اس کے حق میں ہوں۔ لیکن لوگوں کے لئے اس میں مشکلات ہیں۔ یہ حکومت کا کام ہے۔ یوتھ کانگرس وہی کام کر سکتی ہے، جس میں لوگ شامل ہوں۔

سوال:۔ آپ کون سے اخبارات کا مطالعہ پسند کرتے ہیں؟

جواب:۔ میں سب ہی اخبارات دیکھ لیتا ہوں، لیکن کسی خاص کے حق میں نہیں ہوں۔ میں رسائل پڑھنے کا زیادہ شوقین ہوں۔ بس کبھی نظر آ جائیں، تو پڑھ لیتا ہوں۔

میں انٹرویو کے اختتام پر آ پہنچا۔

سوال:۔ آپ کے خیال میں آزادی سے اب تک ہماری سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟

جواب:۔ ہم نے زراعت اور صنعت کے میدان میں نہایت ہی مضبوط معاشی بنیاد تعمیر کر لی ہے۔ یہ بنیاد بہت سے دوسرے ترقی پذیر ممالک حتیٰ کہ چین سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے خشک سالی کا مقابلہ تو ترقی پذیر ممالک کی نسبت زیادہ اچھی طرح کیا ہے —— خشک سالی کے دوران ہماری غذائی ضروریات صرف ایک یا دو فیصد کم تھیں۔ یورپی ممالک میں اب تک کیا ہو رہا ہے۔ اُن کی کمی دس فیصد تک ہے۔ اس سے ظاہر ہے، کہ ہماری بنیاد زیادہ مضبوط ہے۔ ہمیں صرف پاکستان کے ساتھ مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں چین سے بھی مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چین کی آبادی تقریباً ہمارے برابر ہے۔ ان کا رقبہ ہمارے رقبے سے زیادہ ہے۔ اور ان کی آبادی ہم سے کم گنجان ہے۔ ہماری صنعتی بنیاد ان سے زیادہ وسیع ہے۔ چین نے سٹیل، ہیوی انڈسٹری اور دفاع میں زیادہ ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ بشمول تعلیم وہ ہر شعبے میں ہم سے پیچھے ہیں۔ اگر کارخانوں اور مصنوعات کا مقابلہ کیا جائے، تو ہمارا پلّہ بہت بھاری ہے۔

سوال:۔ آپ کے ذہن میں اصل بھارت کیسا ہونا چاہیئے؟

جواب:۔ میں چاہتا ہوں، کہ گاؤں ترقی کریں اور خود کفیل ہوں۔ ہریانہ اور پنجاب نے دیہاتوں میں سڑکوں کے جال بچھا دیئے ہیں۔ دیہاتی معاشیات کے لئے یہ ایک نہایت ہی منفعت بخش ترقی ہے۔ یوپی میں ابھی تک دیہات کا استحصال ہو رہا ہے۔ ابھی وہاں کسان کم قیمت پر فصل بیچتا ہے۔ اور خریدار منڈیوں میں لا کر زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ کسان کو مناسب قیمت میسر نہیں آتی۔ البتہ جنوبی بھارت کے دیہاتوں کے بارے مجھے علم نہیں۔ ہاں، اگر ہمارے جار گنی منصوبے پر عمل درآمد ہو جائے، تو ہمارے پچاس فیصد مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

سوال:- مہاراشٹر کے جبری نس بندی کے قانون کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:- جبری نس بندی بہتر ہے، اگر اس کی پشت پناہی پر تمام مراعات ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ مہاراشٹر کے دیہاتوں میں یہ مراعات پہنچی ہیں، کہ نہیں۔ ان کے بغیر جبر کی ضرورت نہیں۔

میں آخری سوال کی طرف آتا ہوں۔

سوال:- یہ خیال عام ہے، کہ آپ پنجاب کے "داماد" ہونے کی بنا پر اس صوبے کے لئے جانبدار ہیں۔ اور اکثر یہاں آتے رہتے ہیں؟

میرا خیال تھا، کہ وہ مجھ جیسے پنجابیوں کے سامنے اس جانبداری کا اقرار کرے گا۔ مگر وہ مسکرایا

جواب:- ایسا ہرگز نہیں۔ یوپی، آندھرا، کرناٹک، ہماچل، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں ہر جگہ اتنی ہی بار گیا ہوں، جتنی بار پنجاب۔

یہ انٹرویو دورانوں میں دو گھنٹوں میں مکمل ہوا۔ میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، نہ کر سکا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا، کہ اس کے جاننے والوں سے اس کی ابتدائی زندگی کے بارے معلوم کروں۔

سنجے گاندھی دہلی کے ولنگڈن ہسپتال میں چودہ دسمبر ۱۹۴۶ کو صبح نو بج کر ستائیس منٹ پر پیدا ہوا۔ اس کا برج قوس ہے۔ جو فلم سٹار راجکپور کا ہے، جو ۱۹۲۴ میں پیدا ہوا۔ سنجے کے ہاروسکوپ کے مطابق وہ کھیل پسند، پرواز کرنے والا، بے تکلف مگر فلسفی ہو گا۔ ۱۹۷۶ء بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرے گا۔ اس وقت زبان زدِ خلق ہو گا۔ قانونی مسائل میں پھنسے گا۔ اور بالآخر زمانے کو اپنے پیچھے لگا لے گا۔

"سنجے" نام مہابھارت سے لیا گیا۔ اس وقت وہ لوگ اپنے نانا جواہر لعل نہرو کے ہاں، وزیراعظم کی عارضی رہائش گاہ ۱۷ یارک روڈ پر رہتے تھے۔ جب سنجے دو سال کا ہوا، تو گداز جسم والی صحت مند وملا سندھی نے بطور آفیسر استقبالیہ گھر کا چارج لیا۔ وہ اس خاندان کے ساتھ ۱۹۶۴ تک رہی۔ آج کل وہ وزارت امور خارجہ میں ڈائریکٹر ہے۔

میں نے چاندنی تھرا سے درخواست کی کہ وملا سے سنجے کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے

ملاقات کروائے۔ وملا کا کہنا ہے، کہ سنجے مشینوں اور چیزوں کی مرمت میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں ایک ورکشاپ بنا رکھی تھی، اور ہر وقت تجربات میں مگن رہتا تھا۔ ہم اکثر شکستہ چیزیں اسے مرمت کرنے کے لئے دے دیتے۔ اور وہ اس کمال سے DURAFIX لگاتا، کہ وہ نئی معلوم ہوتیں۔ اس نے یہ تکنیکی رجحان اپنے والد فیروز گاندھی سے ورثے میں لیا۔ اس نے اپنے بیٹے کی مدد کی۔

سنجے گاندھی ایک شریر اور شوخ لڑکا تھا۔ وملا کہتی ہے، کہ ایک دفعہ کشمیر میں وہ اپنی کسی سہیلی کے لئے سوئیٹر بن رہی تھی۔ سوئیٹر تکمیل کے آخری مرحلوں میں تھا۔ ایک روز دوپہر میں کچھ دیر سونے کے بعد میں اٹھی، تو سوئیٹر ندارد۔ مسز گاندھی سے معلوم ہوا، کہ سنجے اور راجیو نے سوئیٹر ادھیڑ دیا تھا، اور پام کے درختوں کے گرد سارا اون لپیٹ دیا تھا، صرف یہ معلوم کرنے کے لئے، کہ موٹی وملا آخر کتنا چل چل کر اون اکٹھا کرے گی۔

ہولی کا تہوار نہرو خاندان میں بہت مقبول تھا۔ ہولی کے موقعہ پر سنجے نے مجھ سے کہا تھا، کہ میں تالاب کے کنارے اگر کوئی چیز دیکھوں، جو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتی، کہ کیا ہونے والا ہے، سنجے نے مجھے دھکا دے دیا، اور دونوں لڑکوں نے میرے اوپر رنگ پھینکنے شروع کر دیئے۔

ان شرارتوں کے باوجود سنجے میں ایک نوجوان مرد کی طرح احساسِ ذمہ داری بھی تھا۔ ایک دفعہ ہم لکھنؤ میں تھے، تو مسز گاندھی نے حکم دیا، کہ بچوں کو لے کر الٰہ آباد پہنچوں۔ میں ان کے ساتھ سفر کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ "ودی تم کیوں فکر مند ہو؟" سنجے نے پوچھا۔ میں ٹکٹ خرید لوں گا۔ اور بھائی (راجیو) سامان گاڑی تک لے جائے گا۔ سارا کام دونوں نے کیا، اور میں آرام سے بیٹھی رہی۔ ہم ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ کیونکہ مسز گاندھی بچوں کا مزاج خراب کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

راجیو اور سنجے سخت ڈسپلن کے تحت پروان چڑھے۔ وہ کبھی پارٹیوں میں شامل نہیں ہوتے تھے، خواہ وہ گھر میں ہی کیوں نہ ہوں۔ دونوں بچوں کو کھانے پکانے کی تربیت دی گئی تھی۔ ان کی والدہ انہیں اکثر DO-IT-YOURSELF قسم کی کتابیں لا کر دیتی تھیں۔ جب سارا خاندان وزیراعظم کی نئی رہائش گاہ تین مورتی (آج کل نہرو میوزیم) میں شفٹ ہو گیا، تو سٹاف کو اکثر بلایا جاتا، تاکہ وہ دیکھیں، کہ بچوں

نے آج کیسا پکایا ہے؟ دونوں بھائی ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔

سنجے وقت کا بے حد پابند تھا۔ اگر کار اسے سکول سے لینے دیر میں پہنچتی، تو وہ ناک میں دم کر دیتا۔ اور ہر ایک سے پوچھتا پھرتا، حتیٰ کہ دیر کا سبب معلوم کر لیتا۔

چاندنی چوک کے جیون لعل گابا کی جرمن نژاد بیوی الزبتھ گابا سے بھی ملی۔ یہ خاتون اس زمانے میں سرزن روڈ پر بچوں کے سکول "شونکیتن" کی انچارج تھیں، اور سنجے اور راجیو نے دو تین سال وہیں گزارے تھے۔ مسز گابا کے خیال میں سنجے ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ لیکن اس میں بے پناہ خود اعتمادی تھی۔ ایسی خود اعتمادی جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

الزبتھ گابا کے مطابق سنجے کو انسانوں سے زیادہ جانوروں سے پیار تھا۔ وہ بہت رحمدل تھا۔ مسز گابا اس بات سے اختلاف کرتی ہیں، کہ دونوں بھائیوں میں کوئی خاص قربت تھی۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے، کہ راجیو عام طور پر کھیل میں امپائر بنا رہتا تھا۔

وزیر اعظم کے خصوصی ایلچی اور نہرو خاندان کے دوست محمد یونس کے بیٹے عادل شہریار کا کہنا ہے، کہ سنجے کو کاروں کے ساتھ بے انتہا لگن تھی۔ وہ کار کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی اس نے اپنی کھلونا کار کو کھول کر اس میں بیٹری فٹ کر دی تھی۔

۱۹۶۳ میں وہ کہیں سے ایک بیکار سی کار لے آیا۔ وہ جامع مسجد کے قریب بازاروں سے اس کے سپیئر پارٹس ڈھونڈتا پھرا۔ اس نے اس کار کو ٹھیک کر لیا۔ اور ہم اس پر شہر کی سیر کو جاتے رہے۔ سنجے خطرات میں کودنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ گاڑی تیز رفتاری سے چلاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک جیپ اس کے ہاتھ آئی۔ تو اس نے ہل چلے کھیتوں اور سنگلاخ پہاڑوں کی پٹڑیوں پر دوڑائی۔ اس کا کمرہ ورکشاپ تھا۔ چیزیں توڑنے میں ہم دونوں (عادل شہریار) ایک ہی ذہن کے مالک تھے۔ ایک دفعہ اس نے ہیلی کاپٹر بنانے کی کوشش بھی کی۔

عادل کے مطابق سنجے صرف اس کام میں دلچسپی لیتا، جس میں مسائل سے نپٹنے کی گنجائش زیادہ ہوتی۔ جونہی وہ مسائل سے عہدہ برآ ہو جاتا، تو سارا کام کسی اور کو دے دیتا، تاکہ تکمیل ہو جائے۔

میرے تمام دوست سنجے کے مقابلے میں کند ذہن تھے۔ وہ بہت ذہین اور خود کفیل شخص تھا۔ کچھ لوگ اس کی صاف گوئی سے اسے ناپسند کرتے تھے۔ لیکن وہ مغرور نہیں تھا۔ اگرچہ وہ آسائشیات میں پروان چڑھا، مگر وہ گاندھی جی کی طرح سادگی پسند تھا۔ عادل شہریار کے خیال میں گھر میں کوئی خاص ڈسپلن نہ تھا۔ اگر تھا بھی تو سنجے کے لئے ہرگز نہیں۔ ہر کوئی اس سے خوف کھاتا تھا۔ صرف راجیو اسے ڈانٹ سکتا تھا، اور وہ اکثر اوقات ایسا کرتا رہتا تھا۔

سنجے نفیس خوراک کا شائق نہیں تھا۔ وہ مضحکہ خیز حد تک انڈوں کا شوقین تھا۔ وہ دن میں، لاتعداد انڈے کھا سکتا تھا۔ مگر اس میں شراب یا سگریٹ پینے کی عادت بالکل نہیں تھی۔ سنجے کا ایک اور بچپن کا دوست بتاتا ہے، کہ اس کا کمرہ کھلونوں سے اٹا ہوتا تھا۔ مگر وہ کھلونے چھوڑ کر پرزوں اور پرانے ٹکڑوں میں مصروف رہتا تھا۔

سنجے خوف کے لفظ سے ناواقف تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس سیکنڈ ہینڈ لینڈ روور میں آیا۔ اور مجھے ہمراہ چلنے کو کہا۔ وہ جیپ وسنت وہار کی پہاڑی کی چوٹی کے قریب والی سڑک پر لے گیا۔ اور پھر اسے موڑ کر کھلا چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے بریکیں کام کر رہی تھیں۔ ورنہ میں آج یہ قصہ سنانے کو موجود نہ ہوتا۔

سنجے کو سالگرہ کا تحفہ دینا ایک نہایت مشکل بات تھی۔ وہ ایسی کسی بات کو پسند ہی نہ کرتا تھا۔ اگر آپ اسے کوئی چیز دے ہی دیں تو ہو سکتا ہے، وہ کسی ایسے شخص کو دے دے، جو اس کی تعریف کر دے، یا اسے پہلے نظر آجائے۔

سنجے میں ایڈونچر کی صحیح سپرٹ تھی۔ ایک دفعہ ہم سب کاربٹ پارک گئے، تو آدھی رات کو سنجے ہمیں ہائی کنگ کے لئے لے گیا، اور ہم سب نے دریا کے ساتھ ساتھ دوڑ لگائی۔

ایک دفعہ میں اس کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لئے شملہ گیا۔ آدھے راستے تک وہ ہمیں مجبور کرتا رہا، کہ ہم سرینگر کی طرف چلیں۔ دوست زیادہ تھے، اس لئے ووٹ ڈالنے کا منصوبہ بنا۔ اکثریت نے سرینگر کی حمایت کی۔ چنانچہ جیپ کا رخ سرینگر کی طرف موڑ دیا گیا، اور وہاں ہم نے

دو دن گزارے۔

سنجے کے بہت سے دوستوں اور واقفکاروں کا خیال ہے، کہ وہ ایڈوانچر کا دلدادہ، منصف، بلند اور پکے ارادے والا تھا۔ اور خوف نام کی کوئی چیز اس کی زندگی میں شامل نہیں تھی۔

الزبتھ گابا کے سکول سے سنجے میسوری میں ویل ہام سکول گیا، اور وہاں سے ڈیرہ دون۔ گوتم دیرہ جو کشمیر ہاؤس میں سنجے کا کلاس فیلو تھا، اپنی یادداشتوں کے حوالے سے کہتا ہے:۔

سنجے سنجیدہ طالب علم نہیں تھا۔ وہ انگریزی کے پیریڈ میں آخری قطار میں میرے سامنے ہی بیٹھا کرتا تھا۔ ہم بڑی دلچسپ کتابیں پڑھا کرتے تھے، مثلاً لورنا ڈون اور حاجی بابا اصفہانی۔ لیکن سنجے کے لئے ان میں کوئی چاشنی نہ تھی۔ اسے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی کالج کلر حاصل کرنے یا کلاس مانیٹر یا سکول پریفیکٹ بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ عام طور پر خاموش اور سنجیدہ رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ شرمیلا ہو۔ وہ مصنوعی طریقے سے لوگوں کی دوستی یا ان پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرتا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد میری اس سے ملاقات ایک امریکن سکول کی دعوت میں ہوئی۔ میں نے اس میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی۔ وہ ویسا ہی خاموش اور سنجیدہ تھا۔ اور کسی قسم کا جوشیلا پن نہ تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنی دلی آرزو پوری کرنے یعنی موٹر کار تیار کرنے کی تعلیم کے لئے برطانیہ چلا گیا۔ تین سال تک وہ رولز رائس کار پلانٹ میں بطور اپرنٹس کام سیکھتا رہا۔

سنجے اپنی صلاحیتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بھارت واپس آیا۔ اس نے ٹھوس آغاز کیا۔ اس نے سبزی منڈی کے علاقے میں ورکشاپ قائم کی۔ اور تین مستری ملازم رکھے۔ علیم الدین، تلسی داس اور نارائن دت چودھری۔ یہاں وہ سارا سارا دن کار کے انجن بنانے میں لگا رہا۔ ۱۹۶۹ میں وہ پہلی کار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

چھوٹی کار بنانے کا منصوبہ نجی سیکٹر میں منظور کر لیا گیا۔ سنجے ان سترہ لوگوں میں شامل تھا، جنہوں نے لائسنس حاصل کرنے کے لئے درخواست دی۔ دوسرے درخواست گذاروں میں بجاج، ٹیلکو اور پریمیئر آٹوموبائل بھی تھے۔ ان تین بڑے درخواست گذاروں کی درخواستیں نامنظور کی گئیں، کیونکہ وہ غیر ملکی

امداد چاہتے تھے۔ صرف سنجے گاندھی کو اجازت نامہ ملا۔ باقیوں نے معروضات واپس لے لیں۔ ۱۹۷۰ میں سنجے نے تمام کاروائیاں پوری کر لیں۔

ماروتی (ہوا کی دیوی کا بیٹا) بہت دیر بحث کا موضوع رہا۔ بہت سی بحثوں کا مقصد اندرا گاندھی کی ذات پر حملہ تھا۔ لیکن نیزوں کا رُخ سنجے گاندھی کی جانب تھا۔ وہ ان کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر حملہ آور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے متعلق تھے، اور اخبار بھی اس میں شامل تھے۔ حقائق پر کوئی بھی نہیں تھا۔ ماروتی پر صرف ایک ہی اعتراض کیا جا سکتا تھا، کہ اس کی پیداوار بہت سے بہت کم تھی۔ اگرچہ دوسری تمام کاروں کی نسبت ارزاں تھی۔ تاہم یہ عوام الناس کی سواری نہ بن سکی۔

سنجے پھر بھی موردِ الزام نہیں۔ سپیئر پارٹس بنانے والی فیکٹریوں اور خام مال کی قیمتوں میں اضافہ اس کا باعث تھے۔ سنجے ایک بڑے قرضے کے نیچے دب گیا۔ سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر اس کے حصص عوام میں تقسیم بھی نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اس نے قرض اتارنے کی خاطر بسوں اور روڈ رولرز کو اسمبل کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اب وہ ماروتی میں واپس آ چکا تھا۔ ماروتی کاریں لاتعداد مقدار میں شمالی بھارت میں دیکھی جا سکتی ہیں، اور یہ سو فیصد سودیشی ہیں۔

۱۹۷۴ میں سنجے نے اٹھارہ سالہ مانیکا سے شادی کر لی۔ مانیکا سکھ کرنل ٹی ایس آنند اور مسز آمیتشور آنند کی بیٹی ہے۔ اس کے ماں باپ غیر منقسم پنجاب کے بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مانیکا ایک لمبی تڑنگی خوبصورت کالج بیوٹی کوئین ہے۔ اس کا پہلا خوق صحافت تھا۔ وہ ایک باتصویر ہفت روزہ سوریہ بھی نکال رہی ہے۔ مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش (یعنی ۲ اکتوبر ۱۹۷۶) کو پہلے شمارے کی توقع ہے۔

مسز اندرا گاندھی کے علاوہ بھی سنجے کے کئی نقاد ہیں۔ سنجے کیا کر رہا ہے، اور کس کی ذمہ داری پر کر رہا ہے۔ نقادوں کا سوال ہے۔ میں انہیں جوابی طور پر کئی سوال کر سکتا ہوں۔ کیا وہ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، کہ سنجے غریب لوگوں کے لئے جو کچھ کر رہا ہے، وہ بالآخر قوم کے لئے فائدہ مند ہے؟ کیا ہمارے نشیبی علاقے بہتری نہیں چاہتے؟ کیا ہمیں آبادی پر قابو نہیں پانا؟ کیا ہمیں جنگلات

کی حفاظت نہیں کرنا چاہیئے؟ کیا بدعنوانی کا خاتمہ نہیں ہونا چاہیئے؟ تو پھر ایسے شخص کے لئے پرخاش کیوں، جو یہ سب کچھ کر رہا ہو۔

سنجے نے اپنے جوان کندھوں پر بہت بڑا بوجھ اُٹھا رکھا ہے۔ اس کے سامنے ایک طویل اور کٹھن سفر ہے۔ اس کے راستے میں کیلے کے چھلکے مت پھینکو۔ خوشحال بھارت کی خاطر اس کے سفر میں اس کا ساتھ دو۔ ہم بوڑھی نسل صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنے خوابوں پر عمل پیرا ہونے دو۔

گورُو گول والکر

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی کسی خطا کے بغیر ہی ہم ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں گورو گول والکر میرے لیے سرِفہرست تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات میں آر۔ ایس۔ ایس کی شمولیت، مہاتما گاندھی کا قتل، ہندوستان کو سیکولر سے ہندو ریاست میں تبدیل کرنے کا مطالبہ۔ یہ سب باتیں اس سے منسوب تھیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے میں اسے ملے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے سوایام سیوکسوں (محافظوں) کی ایک فوج سے گذر کر جانا ہوگا لیکن وہاں تو سفید کپڑوں میں ملبوس سی آئی ڈی کے لوگ بھی نہیں تھے جو کم از کم گاڑی کا نمبر ہی نوٹ کر لیتے۔ یہ ایک درمیانے طبقے کا گھر تھا جو تو جا گھر کی طرح نظر آ رہا تھا کمرے کے باہر زنانہ جوتوں کی ایک قطار، اگر بتی کی خوشبو، پردے کے پیچھے عورتوں کی کھسر پھسر، برتنوں کی جھنکار، ایک چھوٹے سے کمرے میں تقریباً ایک درجن لوگ سفید کرتوں اور سفید دھوتیوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی نہا دھو کر آئے ہیں اور ان کے حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مہاراشٹر کے براہمن ہیں

گورو گول والکر، ساٹھ کے پیٹے میں ایک دھان پان سا شخص ہے۔ اس کے کالے سیاہ بال کندھوں پر آ کر گھنگھر بالے ہو جاتے ہیں۔ ہونٹ مونچھوں کے نیچے چھپے ہوئے کھچڑی سی داڑھی لمبی ہے اور ٹھوڑی کے نیچے تک جاتی ہے گہری آنکھیں اور دائمی مسکراہٹ وہ ایک بھارتی ہوچی منہ کی مانند نظر آتا ہے حال ہی میں اس نے سینے کینسر کا آپریشن کرایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر چاق و چوبند نظر آتا تھا۔

چونکہ وہ ایک گرو ہے اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ ایک چیلے کی سی فرمانبرداری کا

متوقع ہوگا۔ جونہی میں اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکا اس نے اپنی مضبوط انگلیوں میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔ "مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی" اس نے کہا "مجھے اس کی خواہش بھی تھی۔" اس نے بڑی شستہ ہندی میں کہا۔

"مجھے بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔" میں نے کہا۔ خاص طور سے جب سے میں نے آپ کی کتاب BUNCH OF LETTERS پڑھی۔" "BUNCH OF THOUGHTS" — وہ میری تصحیح کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کتاب کے متعلق میرے نظریات معلوم کرنے سے لاتعلق ہے۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتا ہے اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ "پھر —؟"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے انٹرویو شروع کروں۔ "مجھے علم ہوا ہے کہ آپ شہرت سے احتراز کرتے ہیں اور آپ کی تنظیم خفیہ ہے —؟"

ج:۔ یہ درست ہے کہ ہم شہرت پسند نہیں کرتے لیکن ہماری تنظیم میں کوئی خفیہ بات نہیں۔ جو کچھ تم پوچھنا چاہتے ہو بلا تکلف پوچھو۔

س:۔ میں نے جیک کیورن کی تحریر "آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو قسطانیت" میں آپ کی تحریک کے بارے میں پڑھا تھا۔

ج:۔ "وہ سب تعصب پر مبنی ہے۔" گرو جی مداخلت کرتے ہیں۔ "غلط اور نادرست اس نے میری طرح اور بھی غلط ریفرنس پیش کئے ہیں۔ ہماری تحریک میں کوئی تشدد نہیں ہم تو ڈسپلن کے قائل ہیں اور یہ تشدد سے بالکل مختلف شئے ہے۔

جب میں نے انہیں بتایا کہ ایک مضمون میں کیورن کو یورپ اور افریقہ میں سی آئی اے کے آپریشن کی کمان حاصل تھی تو انہوں نے کہا

"میں ایسا شک نہیں کرتا۔" لیکن میں بڑی بے ساختگی سے کہتا ہوں "میں اسے گذشتہ بیس سال سے جانتا ہوں۔"

گرو جی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں "میرے لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔" معلوم نہیں ان کا یہ تبصرہ میری بے ساختگی پر تھا یا کیورن کے سی آئی اے

کے سربراہ ہونے پر —

س:۔ R.S.S کے بارے میں ایک چیز مجھے پریشان کرتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو پوچھوں —

ج:۔ بات جاری رکھو —

س:۔ اور وہ چیز اقلیتوں یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے آپ کا طرز عمل ہے

ج:۔ ہم عیسائیوں کے بالکل خلاف نہیں۔ لیکن جب وہ کسی بیمار کو دوا یا بھوکے کو خوراک دیتے ہیں تو اس وقت اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں گویا صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات ہمیں کھٹکتی ہے مجھے خوشی ہے کہ بھارت میں گرجا گھروں کو روم کے زیر اثر سے آزاد اور خود مختار بنانے کی تحریک ہوئی ہے۔

س:۔ اور مسلمان —؟

ج:۔ ان کے بارے میں کیا الزام ہے —؟

مسلمانوں کی پاکستان اور بھارت دونوں کے ساتھ وفاداری پر انہیں الزام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تاریخی عناصر کے حساب سے ہندوؤں پر بھی اتنا ہی الزام عائد ہوتا ہے تقسیم ملک سے لے کر اب تک انہیں عدم تحفظ کا احساس رہا ہے۔ لیکن پھر بھی چند لوگوں کے جرم کی سزا تمام قوم (مسلمانوں کی) کو نہیں دی جا سکتی

س:۔ گورو جی — بھارت میں چھ کروڑ کے قریب مسلمان ہیں۔ "میں ذرا جوش میں آتا ہوں —" ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں نکال نہیں سکتے۔ ہم انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا گھر ہے ہمیں ان کو تحفظ دینا چاہیے کہ وہ اسے اپنا گھر سمجھیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم انہیں محبت سے فتح کریں۔

ج:۔ میں اس کے بالکل الٹ کہوں گا۔" گورو جی مداخلت کرتے ہیں۔ "اصولی طور پر میں چاہوں گا کہ محبت کی مدد سے ان کو مطیع بنانا چاہیئے —"

میں ... رہ جاتا ہوں۔ کیا گورو جی لفظوں سے کھیل رہے ہیں۔ یا واقعی جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہیں جماعت

اسلامی کا ایک وفد مجھے ملنے آیا۔ میں نے انہیں کہا کہ مسلمانوں کو بھول جانا چاہیئے کہ وہ کبھی ہندوستان پر حکومت کرتے تھے اور نہ ہی انہیں دوسرے مسلمان ممالک کو اپنے وطن کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ انہیں ہندو مت کی بالادستی قبول کرنی چاہیئے۔"

س:۔ وہ کیسے ۔"

ج:۔ ہمیں انہیں سمجھانا چاہیئے۔ بعض اوقات ہم مسلمانوں کے اعمال پر سخت برہم ہوتے ہیں لیکن ہندوؤں کا خون دائمی نفرت نہیں رکھتا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے میں رجائیت پسند ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ہندو مت اور اسلام ساتھ ساتھ رہنا سیکھ جائیں گے۔"

چائے پیش کی جاتی ہے۔ گوروجی شیشے کے مگ میں چائے پیتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے باقی سب کی طرح چینی مٹی کے کپ میں چائے کیوں نہیں پی۔ وہ مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس کپ میں چائے پی ہے اور جہاں کہیں جاتے ہیں اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا قریب ترین رفیق کار ڈاکٹر ٹھٹھہ جس نے اپنی زندگی R.S.S کے لیے وقف کر رکھی ہے وضاحت کرتا ہے کہ پورسلین آہستہ آہستہ اپنی سطح چھوڑ دیتی ہے اور نیچے کی مٹی نمایاں ہوجاتی ہے جو جراثیم پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ میں اپنی گفتگو کی طرف لوٹتا ہوں۔

س:۔ آپ مذہب کو بنیاد ہی کیوں بناتے ہیں جبکہ دنیا میں ہر جگہ مذہب سے اجتناب ہوتا جا رہا ہے۔ لا ادریت کا دور دورہ ہے۔

ج:۔ ہندو مت کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں کیونکہ اس کے کوئی نظریات نہیں۔ پہلے اس میں لا ادریت تھی۔ اگر مذہب سے اجتناب کا دور آگیا تو ہندو مت اس کا بہتر مقابلہ کر سکتا ہے۔

س:۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں دنیا میں جتنے مذاہب کو استحکام حاصل ہوا ہے یا انہوں نے لوگوں پر گرفت مضبوط کی ہے ان کے پیچھے نظریات ہی تھے۔ مثلاً کیتھولسزم اور کیتھو لسزم سے بڑھ کر اسلام۔

ج:۔ یہ عبوری دور ہے۔ لا ادریت ان پر قبضہ کرے گی لیکن ہندو مت اس کے غلبے

میں نہیں آئے گی۔ ہمارا مذہب، معروف معنوں میں مذہب نہیں۔ یہ تو دھرم ہے۔ زندگی گذارنے کا طریقہ۔ ہندو مت، لا ادریت کو اپنی تقلید پر مجبور کردے گی۔

مجھے گوروجی کے پاس نصف گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا ان کے چہرے پر بے صبری یا اکتاہٹ کے کوئی آثار نہیں۔ جب میں ان سے اجازت لیتا ہوں تو وہ ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تاکہ میں ان کے پاؤں نہ چھوؤں۔

کیا میں ان سے متاثر ہوا تھا؟ ہاں میں مانتا ہوں۔ انہوں نے اپنا نقطہ نظر مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ناگپور میں ان سے ملاقات کی پیش کش منظور کرلی۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد جو کہ R.S.S کا بنیادی مقصد ہے۔ میں کامیاب ہوجائیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں انہیں اس بات پر مجبور کروں یا ہوسکتا ہے کہ میں ایک عام ذہن والا سیکھ ہی ثابت ہوں۔

جے۔ پی۔ ایک مکمل انقلابی

گذشتہ سال بھارت کی تقدیر بدل دینے والی دو اہم تبدیلیاں رُونما ہوئیں[1]۔

پہلی:۔ جے۔ پی نے عوامی تحریک میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اگر اسے کامیابی ہوئی تو ہمارے آئین سازوں کی جمہوریت کو تار تار کر دے گی۔ جے۔ پی اور اس کے پیروکار اپنی بے پناہ تخریبی طاقت کا اندازہ نہیں رکھتے۔ جو جیسا بیجیں گے، ویسا ہی کاٹیں گے۔

دُوسری:۔ حکمران جماعت یعنی کانگرس اور سی۔ پی۔ آئی —— جے۔ پی کی طاقت کا شعور نہیں رکھتے۔ ایک بگلے کی طرح طوفان دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

بھارت کے شہریوں کو جے۔ پی کی انقلاب کی دعوت پر غور و فکر سے کام لینا چاہیئے۔

جے پرکاش نرائن ایک عظیم آدمی اور اچھا انسان ہے۔ وہ ایک دسرا انسان ہے۔ اور اس نے کبھی ناپسندیدہ کاموں میں برتری نہیں دکھائی —— اُس نے صرف بڑے ہی کاموں میں ہاتھ ڈالا ہے۔ مثلاً شیخ عبداللہ کی گرفتاری —— ناگالینڈ میں بھارتی فوجوں کا ناگوں کا قتل عام —— پاکستان کو نمبر ایک دشمن سمجھنا، اور بنگلہ دیش کی جنگ آزادی، جس کی وجہ سے، وہ پاکستان میں سب سے زیادہ نفرت کیا گیا!۔

نیپال کے سابق وزیر اعظم نے اُسے برصغیر کی علیحدہ، الگ، توانا آواز کہا —— دنیا بھر کی جمہوریتوں میں سب سے زیادہ جمہور کی آواز —— آندری میلر آکس نے اُسے گاندھی کے بعد

---

[1] یہ مضمون ۱۹۷۵ کے اوائل میں لکھا گیا تھا۔

جے پرکاش تحریک آزادیٔ ہند میں شامل تھا۔ مہاتما گاندھی نے جب طالب علموں کو کالج چھوڑ کر تحریک چلانے کو کہا، تو اس نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ ۱۹۴۲ کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کا سب سے بڑا اور حرِ رواں تھا۔ (جب اُس کے اصل دشمنوں اور آجکل کے کمیونسٹوں نے انگریزوں سے سازباز کی تھی) ۱۹۶۷ میں اُس نے ذاتی حیثیت میں بہار کے قحط زدہ لوگوں کو موت کے منہ سے بچایا۔ اس نے کئی سال سرودیہ اور بھودان کی تحریکوں میں صَرف کیئے۔ ۱۹۷۲ میں چنبل کی وادیٔ کے ڈاکوؤں کا صفایا حکومت، پولیس یا فوج کی بجائے جے پرکاش نے کیا تھا۔

ان سب مہمات نے جے پرکاش نرائن کو ایک جائیز خطاب عطا کیا۔ "قوم کے ضمیر کو زندہ رکھنے والا۔" اس نے کبھی کسی عہدہ کی خواہش یا کوشش نہیں کی۔ اس لیئے دوسرے سیاسی لیڈروں کے برعکس اُس کی بے انتہا عزت کی جاتی ہے۔ وہ کون سی، قوتیں تھیں، جنہوں نے ایک انسان کو اس درجے تک پہنچایا۔

جے پرکاش ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ کو بہار کے ایک گاؤں ستابدبن میں کائستھ گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک معمولی سرکاری ملازم تھا۔ وُہ چھ بچوں میں سے تیسرے نمبر پر تھا۔ چند سال گاؤں کے پرائمری سکول میں گزارنے کے بعد وُہ پٹنہ کے ہائی سکول میں بھیجا گیا۔ وہ سکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر ویٹ مور سے بہت متاثر ہوا۔ "مہاتما گاندھی نے طالب علموں کو تعلیم چھوڑنے اور آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کا حکم دیا، تو ہم نے امتحان دینے سے انکار کر دیا۔ مسٹر ویٹ مور سوائے سزا دینے کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ پہلے اُس نے ہمیں سزا دی، کہ یہ اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ پھر اُس نے ہماری حُب الوطنی پر ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس کے احساسِ فرض اور ہمارے ساتھ ہمدردی کے رویے نے ہمیں خاصا متاثر کیا ——" جے پرکاش دہراتا ہے۔

اپنی شاندار جسمانی ساخت کے باوجود جے پرکاش کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ——

"میں اپنا فارغ وقت بھی پڑھنے میں گزارتا تھا۔ میرا باپ مجھے بوڑھا لڑکا کہا کرتا تھا۔"

پندرہ سال کی عمر میں جے پرکاش نے سکول کی تعلیم مکمل کر لی، اور ایک پکے قوم پرست اور مالدار وکیل کی بیٹی پربھاوتی سے شادی کر لی۔

مہاتما گاندھی کے اس حکم پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے جے پرکاش ماضی کو یاد کرتا ہے۔ فائنل امتحان دینے سے ایک ماہ قبل مولانا آزاد پٹنہ آئے اور جے پی سے کہا، "جب تک گاندھی جی ایسے مدرسے نہیں کھولیں گے، جہاں بچوں کو قوم پرستی کی تعلیم دی جائے، لوگ کہتے ہیں، کہ وہ اپنے بچوں کو سکولوں سے نہیں اٹھائیں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا، کہ ہم اس وقت تک زہر پیتے جائیں گے، جب تک ہمیں نکوٹین فراہم نہ کی جائے۔۔۔"

جے پرکاش نے سالانہ امتحان نہیں دیا۔ اگست ۱۹۲۲ میں اُس نے گاؤں کو خیرباد کہا، کلکتہ سے ایک جہاز پر سوار ہوا، اور دو ماہ بعد سان فرانسسکو جا پہنچا۔ وہ یونیورسٹی میں داخلے کے لئے لیٹ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک فارم پر ملازمت حاصل کر لی۔ بعد ازاں وہ پھلوں کو محفوظ کرنے کی فیکٹری میں ملازم ہو گیا۔ وہ برکلے یونیورسٹی کی فیس ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس لئے اس نے آئیوا اسٹیٹ یونیورسٹی میں مائیگریشن کروالی۔ وہاں چند سمسٹر گزارنے کے بعد وہ وسکونسن چلا آیا۔۔۔ "مجھے امریکی دوست اچھے لگے۔ میں لڑکیوں کے ساتھ ڈانس پارٹیوں میں جانے لگا۔ انہوں نے میرا انگریزی نام 'لیری' رکھ دیا۔"

امریکہ میں ہی جے پرکاش ایک پکے قوم پرست سے مکمل مارکسٹ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ پولش یہودی ابوروم لینڈی سے متاثر ہوا۔ لینڈی ایک ذہین طالب علم، شاعر اور کیمونسٹ تھا۔ لینڈی نے جے پرکاش کو بھارتی کیمونسٹ پارٹی کے ورکروں یعنی ایم۔ این۔ رائے سے متعارف کرایا۔ وہی رائے جس نے بعد میں عدم تعاون کی تحریک چلائی۔ گاندھی جی کی اہنسا کی تحریک کے بالکل مخالف۔۔۔

جے پی امریکہ کی کیمونسٹ پارٹی کے علمی شعبہ میں شامل ہو گیا۔ اس نے لینن، ٹراٹسکی،

روزا لکسمبرگ اور کارل کاٹسکی کا مطالعہ کیا۔ میں نے 'داس کیپٹیل' کے چند ابواب بھی پڑھے۔ اور ایک میکسیکن ایمانوئیل گومز نے جے پرکاش کو سائنس اور حساب کی بجائے سوشیالوجی کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ اور اس نے اورنٹیل یونیورسٹی آف ماسکو میں داخلہ لینے کو کہا۔ اسے روس میں داخل ہونے کے لئے چار سو ڈالر کی ضرورت تھی۔

جے پرکاش یہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ امریکہ اس وقت معاشی بحران سے دوچار تھا۔ جے پرکاش ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری تک کوشش کرتا رہا، لیکن کہیں سے مدد حاصل نہ ہو سکی۔ غیر ملکیوں اور کالوں کو روزگار نہ ملتا تھا۔ بعض جگہ پر تو ہندوؤں پر ملازمت حاصل کرنے کی پابندی تھی۔

بالآخر جے پرکاش کو ایک جگہ چپڑاسی کی نوکری ملی اور اس نے اوہیو میں کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس نے بیچلر ڈگری کے ساتھ ساتھ وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی نو سو شلنگ سالانہ کی گریجویٹ امداد بھی حاصل کی۔ اس نے ایم۔ اے تجزیۂ کردار کی سائنس میں کیا، اور سالانہ امتحان میں سو فیصد نمبر حاصل کیئے۔ فارغ اوقات میں وہ کلیولینڈ کی ایک ٹریڈ یونین کے دفتر میں کام کرتا رہا۔

جے پرکاش ۱۹۲۹ میں بہار واپس آیا۔ امریکہ کے متعلق اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے، "میں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس لئے کیمونسٹ مجھے امریکی ایجنٹ کہتے ہیں۔ امریکہ میں میں نے سر نگوں، فیکٹریوں اور مذبح خانوں میں ملازمت کی۔ میں نے بیرا گیری کی۔ اور بعض اوقات تو ہوٹلوں میں کموڈ بھی صاف کیئے۔ یہ لوگ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ پھر میں مارکسٹ ہو گیا۔ لیکن سٹالن نواز نہ بنا۔ جب میں ہندوستان واپس آیا، تو میں کیمونسٹ تھا۔ لیکن میں نے کیمونسٹ پارٹی کی بجائے کانگرس میں شمولیت اختیار کی۔

جے پرکاش بھارتی سیاست میں شامل ہو گیا۔ پہلے اس نے کیمونسٹوں کو دیکھا۔ صفِ اوّل کے لیڈر جیل میں تھے۔ دوسروں نے اسے متاثر نہ کیا۔ اس دوران اپنے شوہر کی سات سالہ

غیر حاضری میں پربھاوتی گاندھی جی کی پیروکار بن گئی۔ وہ واردھا کے گاندھی آشرم میں جے پرکاش کو لے کر گئی۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ مختصر سی ملاقات میں ہی جے پرکاش کے اختلاف ہو گئے۔ پہلے وہ گاندھی جی کی بہت سی تعلیمات مثلاً چرخہ بافی اور سبزی خوری کو جائز سمجھتا تھا۔ پربھاوتی نے اُسے مجبور کیا، کہ آشرم میں گاندھی جی کے سیکس کے خلاف نظریئے کو بھی مان لے۔ کچھ دیر جے پرکاش اپنے اس نظریئے پر قائم رہا، کہ گاندھی جی ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے ختم ہو چکے ہیں۔ گاندھی کے پیروکار گاندھی کو اتنا نہیں جانتے تھے، جتنا گاندھی اپنے پیروکاروں کو۔ مہاتما گاندھی نے پیشن گوئی کی، کہ ایک دن جے پرکاش اُن کی زبان بولے گا۔ ۱۹۳۰ میں جواہر لعل نہرو نے بھارت کا صدر منتخب ہونے کے بعد جے پرکاش سے کہا، کہ وہ کانگریس میں شامل مزدور طبقے کی راہنمائی کرے۔ دو سال بعد وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹریوں میں شامل تھا۔ تقریباً اُسی زمانے میں کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا اور جے پرکاش کو قید کر لیا گیا۔

ابھی وہ مارکسزم سے باہر نہیں نکلا تھا۔ جیل میں وہ سرخوں کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا، جو گاندھی سے اختلاف رکھتے تھے۔ سکالروں کی طرح نفرت آمیز لہجے میں اُس نے گاندھی کو رجعت پسند کہا، اور گاندھی کے غریبوں کے لئے جذبۂ ترحم کو ایک سرپھرے انسان کی دوستی گردانا۔ گاندھی اپنے نوجوان نقادوں کو صرف ایک خطاب دیتا تھا —— "جلد باز لوگ ——"، پھر اُنہیں کانگریس کے سوشلسٹ گروپ میں داخل کر دیتا تھا۔

جے پرکاش گاندھی کی نسبت نہرو کے زیادہ قریب تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران گاندھی کو چھوڑ کر نہرو کے ساتھ نئی پارٹی بنانے میں جے پرکاش پیش پیش رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بھارت میں انقلاب کا سماجی کام اسی طرح مکمل ہو گا۔ اس نے اعلان کیا، کہ گاندھی جی کے فلسفہ کا وقت گذر چکا ہے، اب اسے زیادہ دیر جاری رکھنا حماقت ہے۔ اب ہمیں سوشلزم کے جھنڈے تلے مارچ کرنا چاہیئے۔

گاندھی، نہرو اور جے پرکاش کے خیالات جنگِ عظیم کے متعلق ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ گاندھی اہنسا کے چکر میں تھا، نہرو فاشزم کے خلاف اور مارکسٹ جے پرکاش اس سامراجی جنگ کو عوام کی جنگ آزادی بنانے کے درپے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اینٹی برطانیہ کہتا تھا۔ سب کے سب برطانوی جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہی جے پرکاش کا نام بھارت میں عام ہوا۔ قید خانے میں دھوتیوں کو گانٹھیں لگا کر اس نے چھ میٹر لمبا رسہ بنایا، اور جیل سے بھاگ نکلا۔ اس نے بڑے پیمانے پر تباہی کو منظم کیا۔ ریلوے لائنیں اکھاڑ دیں، سڑکوں پر بم پھینکے اور مشرقی محاذ پر فوجی دستے اور گولہ بارود بھجوایا۔ وہ پکڑا گیا۔ مگر وہ ایک ناقابلِ فراموش ہیرو بن چکا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا ادراک ہو گیا، کہ مقصد حاصل کرنے کی خاطر طاقت کا استعمال درست نہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جب میسانی بھارتی مقننہ کے لئے منتخب ہوا، تو اس نے اپنے دوست کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس کا کہنا تھا، کہ اس کا دوست جے پرکاش اتنا بے ضرر ہے، کہ مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ جے پرکاش نے آگرہ جیل سے اسے لکھا؛ "کیا تمہارا خیال ہے، کہ صرف ان شریف آدمیوں کو جو مکھی بھی نہیں مار سکتے، جیل سے رہا کرنا چاہیئے ——؟"

۱۹۵۳ تک جے پرکاش نے عوام میں اپنے مارکسی ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اُس نے پونا میں تین ہفتے کا برت رکھا۔ "میں نے تین ہفتے سوچ بچار میں گزارے ہیں ——" اُس نے ایک دوست کو خط لکھا۔ "میں نے مارکسزم کی فلسفیانہ بنیادوں کو مسترد کر دیا ہے۔ جدلیاتی مادیت وغیرہ۔ کیونکہ ان میں مجھے اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ کوئی شخص کیوں اچھا ہو، یا کسی شخص کو کیوں اچھا ہونا چاہیئے ——؟"

بھودان پروگرام کے دوران سرودیا تحریک کے زیرِ اثر بالآخر جے پرکاش نے آرجیہ ونوبھاوے میں شمولیت کرتے ہوئے گاندھی جی کا راستہ اپنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمیونسٹ ممالک کا سب سے بڑا نقاد بن گیا۔ ۱۹۵۶ میں روس کے ہنگری پر اور ۱۹۵۹ میں چین

کے تبت پر قبضے کی اس نے مخالفت کی۔ جے پرکاش نے کبھی وضاحت نہیں کی، کہ "مکمل انقلاب" سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ تعریفوں یا وضاحتوں سے ہمیشہ گھبراتا ہے۔ لیکن اس کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ بھارت کے عوام کی سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی اقدار کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے ستائیس سال بعد بھی لوگ کچلے ہوئے ہیں۔ بھوک، بڑھتی ہوئی قیمتیں اور بدعنوانیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ عوام ہر قسم کی ناانصافی کا شکار ہیں۔ ۱۹۷۵ میں پٹنہ میں عوام کو انقلاب کی طرف راغب کرتے ہوئے اُس نے کہا، "تعلیمی ادارے بدعنوان ہو چکے ہیں۔ ہزاروں نوجوان تاریک مستقبل کا سامنا کرتے ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ غریب لوگوں کا کام دن بدن کم ہو رہا ہے۔ حدِ اراضی کے قانون وضع کئے جا رہے ہیں، مگر بے گھر لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

اس کے مخصوص نشانے میں ریاستی مقننہ آتی ہے۔ بہار کی قانون ساز اسمبلی کو ایک کھلے خط میں اُس نے لکھا، "دوستو! اگرچہ ۱۹۷۲ کے عام انتخابات نے آپ کو عوام کا نمائندہ ثابت کیا، مگر آپ اپنا حق نمائندگی کھو چکے ہیں۔ اور اس کے مزید قابل نہیں، کہ یہ نمائندگی کریں۔ ہمارے جمہوری اداروں اور ان کے طریقۂ عمل میں اتنی خرابیاں ہیں، کہ کسی بھی مسئلے کو آئینی طریقے سے حل کرنے کی دلیل اپنے معنی کھو چکی ہے۔" اس کے خیال میں دیہاتی کونسلوں کو سیاسی وابستگی کی بجائے کردار کی پختگی کو مدنظر رکھ کر اُمیدوار منتخب کرنے چاہئیں۔ اور عوامی کمیٹیوں کو ایسے منتخب لوگوں پر گہری نظر رکھنی چاہیئے۔

اُس کے پروگرام میں گھیراؤ، دھرنا دینا اور بطور احتجاج برت شامل ہیں۔ اُس نے مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گروپ تشکیل دیئے ہیں، تاکہ وزیروں اور اعلیٰ افسروں، تاجروں اور بڑے زمینداروں کے بچوں کو مجبور کیا جائے، کہ وہ بدعنوانی ختم کرنے کے لئے اپنے اپنے گھر میں کم از کم بارہ گھنٹے کا برت رکھیں۔ تاکہ اُن کے بڑے بدعنوانی جیسی لعنت کو ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس فوج اور پولیس سے اپیل کی ہے، کہ وہ عوام کو سفاکانہ طور پر قتل کرنا بند کر دیں، اور عوام سے اپیل

کی ہے، کہ وہ لاٹھیاں کھانے، گولیاں کھانے، جیل جانے اور جائداد قرق کروانے کی پرواہ نہ کریں۔ تاہم یہ سب کچھ تشدد کے بغیر ہونا چاہیئے۔ آگ زنی یا لوٹ کھسوٹ انقلاب نہیں لاتے۔ ہمیں گاندھی جی کی طرف لوٹنا ہوگا۔

مینو میسانی، جے پی کا ایک قریبی آدمی کہتا ہے، "اس آدمی کی دیانت بے مثال ہے۔ شائد وہ بھارت میں بہترین جمہوریت کی آخری اُمید ہے۔ اگر اُس کی صحت نے اجازت دی (کیونکہ اس کی عمر ۷۲ سال ہے، اور وہ شوگر کے ساتھ دل کا مریض بھی ہے) تو وہ کامیاب ہوگا۔ تاریخی قوتیں اُس کے ساتھ ہیں۔"

نارائن کے لئے جو جذبہ مینو میسانی کا ہے، وہ رجنی پٹیل کا نہیں۔ جو اس وقت بمبئی سٹی کانگرس کمیٹی کا صدر رہا ہے۔ اور مسز گاندھی کا کیمبرج یونیورسٹی کے زمانے کا رفیق ہے۔ اُسے مہاراشٹر کا بادشاہ گر بھی کہا جاتا ہے۔ پٹیل کسی زمانے میں پکا کمیونسٹ تھا۔ اور آزادی کی تحریک کے دوران حکومتِ برطانیہ نے اسے جیل میں لا ڈالا جس میں میسانی اور نارائن بھی تھے۔ جس نے اسی ٹرین میں سفر کیا، جس میں جے پی احمد آباد سے بمبئی لایا گیا تھا۔ اُس کا استقبال کرنے والے لوگ بہت تھوڑے ہوا کرتے تھے۔ یہ صرف صحافیوں کا کام ہے، جو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ وہ (جے پی) ایسے باتیں کرتا رہا ہے، جیسے گاری بالدی، لینن اور مہاتما گاندھی کی رُوحیں اس اکیلے میں جمع ہو گئی ہوں۔ جُوں جُوں اُس کے ذہن کا انتشار بڑھتا گیا، اُس کی کوششیں ناکام نظر آتی گئیں۔"

پٹیل اور میسانی کے تاثرات بالکل الگ ہیں۔ انتظامیہ اسے ایک غیر ذمہ دار، انتشار پسند فرد سمجھتی ہے۔ جو جمہوریت کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکاتا ہے۔ اُس کے معترف اُسے گاندھی حکومت اور کمیونسٹوں کی تباہ کردہ جمہوریت کا محافظ سمجھتے ہیں۔

دونوں کی آراء ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوئے خود فاشزم کا ثبوت ہیں۔

جے پرکاش کسی پارٹی کا سربراہ نہیں، اور نہ ہی وہ اپنی تحریک کو کسی پارٹی کے زیرِ اثر گردانتا ہے۔ اندرا گاندھی کے نو سالہ عہدِ حکومت کو ختم کرنے کے لئے حزبِ اختلاف، انتہائی دایاں بازو،

جن سنگھ، آر ایس ایس، اور دوسری طرف آنند مارگ، سوشلسٹ، انتہا پسند مارکسٹ اور مارکسٹ لینینسٹ گروپ اس کی میٹنگ میں آتے رہتے ہیں۔ اس کے بہت سے ہمدردوں میں ایسے سیاستدان بھی ہیں، جن کو کمیونسٹ بدعنوان کہتے ہیں۔ ایسے صنعتکار بھی ہیں، جو پارلیمنٹ کے آزاد رکن ہیں۔ جیسے رام ناتھ گوانیکا، جو ایکسپریس کا مالک ہے، اور جو جے پی کا ہفت روزہ ایوری مینز ویکلی نکالتا ہے۔

اس وقت حکومت اور ماسکو نواز کمیونسٹ تمام حزبِ اختلاف سے زیادہ مضبوط ہیں۔ اور انہوں نے کئی ضمنی انتخابات میں سابقہ امیدواروں کو شکست دے کر کانگرس کو مضبوط بنا لیا ہے۔

جے پرکاش بہار میں نہایت ہی مضبوط اُمیدوار ہے۔ بہار اور ملحقہ مشرقی علاقوں مثلاً اُتر پردیش میں اس کے پیروکاروں کی تعداد نوے فیصد کے قریب ہے۔ ملک کے باقی علاقوں میں یہ سطح حکومت کے خلاف لوگوں کی تحریک پر مبنی ہے۔ طالب علموں کی بہت بڑی تعداد اس کی "تعلیم چھوڑ دو" کی پالیسی پر عمل نہ کرنے کے باوجود اس کی مددگار ہے۔ کانگرس یا کمیونسٹوں کے زیرِ اثر ٹریڈ یونینوں نے اس کی ہڑتال کرنے کی اپیلوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے جلسوں میں جن میں سب سے بڑا بمبئی میں ہوا، زیادہ تعداد میں لوگ انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ حالانکہ ساری آبادی کا تقریباً تین فیصد انگریزی بولتا ہے۔ مینو مسانی کا کہنا ہے، کہ یہ ایک درمیانے درجے کا انقلاب ہے، جس کی راہنمائی جے پی کر رہا ہے، اور وہ خوش ہے کہ اس میں نوجوان شامل نہیں ہیں۔

تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ جے پی کی تحریک صرف اس کی شخصیت کی وجہ سے کامیاب ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت وہ زبان استعمال کر رہا ہے، جو ملک کا انٹلیکچول طبقہ بھی سمجھ رہا ہے، اور گلیوں محلوں میں رہنے والا بدحال آدمی بھی۔ کانگرس کے ایک پارلیمنٹ ممبر کا کہنا درست ہے، کہ جے پی کا "مکمل انقلاب"، ایک مکمل شکست ہوگی۔

اگرچہ اس چُوں چُوں مُربّہ کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، کہ اس میں بہت سے لوگ اندرا گاندھی مخالفت کی بنا پر شامل ہیں۔ تاہم جے پی کی تحریک کی قوت کو نظر انداز نہیں

کیا جا سکتا۔ بھارت میں انتخابات امیدواروں کی شخصیت اور نعروں کی بنا پر جیتے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۱-۷۲ کے انتخابات میں مسز گاندھی کی فتح بنگلہ دیش کا فاتح ہونے کی بنا پر تھی۔ انہوں نے ملک کو ایک نعرہ دیا "غریبی ہٹاؤ" اور پھر سارا ملک اس سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ اور عوام نے اسے 'اندرا لہر' کا نام دیا۔ اس وقت سے غریبی ختم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانی، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری بھی پروان چڑھی ہے۔ اندرا گاندھی کا بُت پاش پاش ہو گیا ہے۔

دوسری جانب جے پی کی صورت میں مہاتما گاندھی کی تجسیم ہو گئی ہے۔ اُس نے بھی ایک نعرہ دیا ہے "بھرشٹاچار" مٹاؤ یعنی بدعنوانی ختم کرو۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے، کہ کانگرس کو ہٹانے کے لئے 'جے پی لہر' سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگلے سال جب عام انتخابات ہوں گے، تو اس یُدھ کی بڑی توقع ہے۔

جے پی نے کئی مرتبہ یقین دہانی کرائی ہے، کہ اس کی تحریک گاندھی کی طرح عدم تشدد پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں کئی مواقع تشدد کے آئے ہیں۔ گجرات میں ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کے درمیان تصادم میں صوبائی اسمبلی کے کئی ارکان کو مارا پیٹا گیا، اور بالآخر اسمبلی کو توڑنا پڑا۔ جے پی نے گجرات کی مثال دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ بہار کی قانون ساز اسمبلی بھی معزول کی جائے۔

جگجیون رام جو گذشتہ ۲۵ سال سے بہار سے منتخب ہو رہے ہیں، جے پی کی قوت سے آگاہ ہیں، اور کمیونسٹوں پر جے پی کی طرح تنقید کرتے ہیں۔ بہار اور اُتر پردیش کے کئی کانگرس ممبران نے جے پی کے گاندھی جیسے کردار کی تعریف کی ہے۔ بدعنوانی اور جبر کے خلاف جہاد میں اس کا ساتھ دیا ہے۔ اور مسز گاندھی کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ جے پرکاش کے ساتھ مذاکرات کریں۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اگلے انتخاب میں بہت سے لوگ کامیابی حاصل کرنے کی خاطر جے پی کے ہمراہ ہو جائیں۔ اب یہ کوئی راز نہیں رہا، کہ جگجیون رام اور یشونت راؤ چوان مسز گاندھی کو ہٹانے

سے خواہشمند ہیں۔

مسز گاندھی اس دھمکی سے بھی آگاہ ہیں، جو جے پرکاش کی صورت میں اُن کے لئے موجود ہے۔ اُنہوں نے مجھے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا، کہ جے پرکاش کی تحریک میں "احتجاج" کا عنصر نمایاں ہے۔ اور اس ملک میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن پر احتجاج کیا جا سکتا ہے۔

"اگرچہ بہت سی باتیں غلط ہیں۔" اُنہوں نے کہا، "تاہم جے پرکاش کی تحریک یا منشور میں ہمیں اپنے مسائل کا کوئی واضح حل نظر نہیں آتا۔ اس میں شامل بہت سے لوگوں کی رائے ہے، کہ ایک منتخب اکثریت کسی کام کی نہیں۔ اور اگر لوگ اکثریت کو منتخب کرتے ہیں، تو اس کا مطلب ہے، کہ لوگ غلط ہیں یہی وجہ ہے، کہ میں اسے فاشسٹ تحریک کہتی ہوں۔"

حیران کن تو بات یہ ہے، کہ جے پی کی تحریک کے بہی خواہ ایسے لوگ بھی ہیں، جنہیں عوام بدعنوان کہتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں، کہ پوری تحریک ہی بدعنوان ہے۔ بلکہ میری توقع تو یہ ہے، جو لوگ بدعنوانی کے خلاف ہیں، آئیں، اس تحریک کی مدد نہیں کرنا چاہتے۔ اگر آپ بدعنوانی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، تو پھر آپ کو بدعنوان افراد کو باہر نکالنا ہوگا۔ میں نے مسز گاندھی سے پوچھا، کہ حکومت جے پی کی تحریک کو روکنے میں ناکام کیوں رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا، کہ حکومت نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ ہم لڑائی جھگڑا نہیں چاہتے۔ ہم اسے گرفتار کر سکتے تھے۔

مسز گاندھی انتخابی اصلاحات اور انتخابات کے دوران سرمائے کے استعمال کے خلاف بات تو کرتی ہیں، لیکن جے پی کی یہ بات نہیں مانتیں، کہ عوام کے اصرار پر قانون ساز ادارے کالعدم قرار دے دیئے جائیں۔

جے پی کے بدگو (اور ان کی تعداد کافی ہے) کہتے ہیں، کہ اس کے خیالات میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ ایک مسلم عالم اور مہاراشٹر حکومت میں سینئر وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا کا خیال ہے، کہ جے پی کی ساری زندگی تضادات میں گزری ہے۔ امریکہ میں مارکسٹ ہونا، بھارت میں مارکسزم کے خلاف ہو جانا، نہرو کا معترف اور پھر اینٹی نہرو، بھودان کی تحریک میں شامل

ہونا، اور پھر لاتعلق ہونا۔ گذشتہ تیس سالوں میں جے پی صرف ایک چیز پر مستقل مزاج رہا ہے، اور وہ ہے اپنی غلطیوں کا اعتراف۔ آج بھی وہ ایسا ہی ہے۔ وہ مکمل انقلاب کی بات کرتا ہے۔ ماؤ اور لینن کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن ان کے خلاف بھی ہے۔ وہ فوجی ڈکٹیٹروں مثلاً پاکستان کے صدر ایوب کی تعریف بھی کرتا ہے۔ وہ حکمران جماعت کی ماسکو نواز کمیونسٹوں کے ساتھ آمیزش پر تنقید کرتا ہے۔ لیکن پیکنگ نواز نکسل پارٹیوں، سوشلسٹوں، جن سنگھیوں حتیٰ کہ آنند مارگ کی مدد بھی حاصل کرتا ہے۔ اس کا مکمل انقلاب کوئی معاشی لائحہ عمل نہیں بناتا۔ اس کی تحریک کانگرس کے خلاف منتشر جماعتوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے پاس بھارت کے معاشی مسائل کا کوئی حل نہیں۔ وہ جمہوریت بچاؤ کا نعرہ لگاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہتا ہے، کہ سیاسی جماعتیں ختم ہونی چاہئیں۔ جے پرکاش کے لئے بہترین خطاب مسٹر کنفیوژن ہو سکتا ہے۔

اب وقت آ گیا ہے، کہ ہم اپنی تمام تر توجہ مکمل انقلاب پر مرکوز کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں مسائل کے بارے میں واضح ہونا چاہیئے۔ ہمیں جے پی نواز یا اس کے خلاف ہو کر سوچنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ ہم اس کی تحریک کی حمایت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں ذاتی تعصب سے گریز کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی بغیر کسی وجہ کے حکمران جماعت کے خلاف ہونا چاہیئے، کیونکہ ہم بھارت کے مستقبل اور جمہوریت کے خواہاں ہیں۔

جے پی نے کانگرس اور انتظامیہ کے خلاف جو الزامات لگائے ہیں، اُن میں وزن ہے۔ بدعنوانیاں تو ضرور موجود ہیں، اور حکومت نے انہیں ختم کرنے کے لئے کئی آرڈیننس بھی جاری کئے ہیں۔ انتخابات کے دوران پارلیمنٹری یونٹوں نے عوامی تحاریک کو کچلنے کی کوشش کی ہے، اور کانگرس پارٹی نے انتخابات جیتنے کے لئے کالا دھن استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ کام صرف کانگرس نے ہی نہیں کئے، دوسری پارٹیوں نے بھی اس سے اجتناب نہیں کیا۔ حکومت سے زیادہ حزب مخالف نے قانونی اور جمہوری اداروں کو تباہ کیا ہے۔ یہ صرف اور صرف ان لوگوں کی مہربانی ہے، کہ آج ایمرجنسی قائم ہے۔ ان کے گھیراؤ، جلاؤ اور دھرنا مارو کی پالیسیوں

نے حکومت کو مجبور کیا ہے، کہ وہ جمہوری طریقے کی بجائے آرڈی نینس کا سہارا لے۔

کانگرس اور حکومت دونوں جمہوریت کا گلا گھونٹنے کی ذمہ دار ہیں۔ کیرالا میں اکثریتی کیمونسٹ حکومت کا اختتام اور گجرات میں صدر راج کا نفاذ بہت بڑی حماقتیں تھیں۔ حکومت کو یہ ثابت کرنا ہوگا، کہ انتخابات آزادانہ ماحول میں ہوں گے۔ کسی کی جیت سرمائے کی طاقت پر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری حزبِ اختلاف بشمول جے پی پر ہوگی۔

اگر یہ شخص صحیح طریقے سے منتخب ہو کر آتا ہے، تو پھر اسے اپنے فرائض انجام دینے میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیئے۔ اُسے جبراً ہٹانا نہیں چاہیئے، جب تک کہ اس کے ووٹ دہندگان اُسے خود نہ ہٹائیں۔ یہی جمہوریت کی بنیاد ہے، اور جے پی کی تحریک اس کی بیخ کنی میں کوشاں ہے۔

جادو بھری آواز ۔ رُونا لیلیٰ

ایک رات مجھے اسے سننے کا اتفاق ہوا آج بھی نصف شب کے قریب اس کے نغمے میرے کانوں میں گونجتے ہیں نغموں کی شاعری البتہ صحیح طور پر یاد نہیں ایک تو فیض احمد فیض کی شاعری تھی جس میں بادلوں اور شراب کی خواہش تھی اور پھر ہر خواہش سے بے نیازی دوسرے ایک بنگلہ لوک گیت تھا جس میں عاشق قسمیں کھا کر محبوبہ سے محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ آخری گیت ایک ملتانی گیت تھا جس کا ایک لفظ میری سمجھ میں نہ آیا لیکن اس گیت نے سب سے زیادہ لطف دیا۔ کومیئر اجیت سیٹھی درست کہتا ہے کہ رونا کو کانوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے بھی سننا چاہیئے۔ اس کی خوبصورت آواز اُداس چہرہ اور مترنم ادائیگی نے میری نیند تباہ کر دی۔ وہ کون یاجی تھا جس نے اس کی مسکراہٹیں اداس کر دی تھیں۔ یہ میں ہی تھا جیسا کہ ڈاؤسن نے کہا۔ پرانے جذبوں کا اسیر۔ آج کی رات اس خوبصورت شرابی مترنم آواز اور بنگلہ دیش کی حسینہ کے نام تھی۔

پردہ اٹھنے سے پہلے مجھے چند لمحے رونا لیلیٰ کی والدہ بیگم سید امداد علی سے گفتگو کے لیے مل گئے ان پانچ منٹوں میں اپنی بیٹی کے مستقبل سے زیادہ وہ اپنے خاندان کی عزت و توقیر کے متعلق گفتگو کرتی رہی (میاں امداد چٹاگانگ میں کسٹم آفیسر ہیں) رونا۔ دراصل رونا لیلیٰ ۲۲ سال قبل سلہٹ میں پیدا ہوئی گویا پیدائشی طور پر وہ ہندوستانی ہے اس کے باپ نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور پھر یہ خاندان ملتان جا کر آباد ہوا تمام زبانیں رونا لیلیٰ نے موسیقی کے ذریعے سیکھیں۔ وہ ایک رقاصہ بننا چاہتی تھی لیکن آل پاکستان میوزک کونٹسٹ میں اس نے پہلا انعام حاصل کیا تو پھر اس کی توجہ موسیقی کی طرف ہو گئی۔ اس نے استاد کادو بھوپالی سے تربیت حاصل کی۔ موسیقی کے مقابلوں سے فلموں

تک اور پھر فلموں سے سٹیج شو تک اس نے بنگالی، پنجابی، ملتانی، پشتو، سندھی، اُردو اور ہندی کے تقریباً تین ہزار نغمات ریکارڈ کروائے ہیں، اب وہ لتا، آشا اور کشور کی طرح اعلیٰ ترین معاوضہ وصول کرتی ہے۔ بمبئی کے ایک پروگرام میں اسے چودہ ہزار روپے پیش کئے گئے سامعین کی اس حوصلہ افزائی سے وہ اس معاوضے کو دوگنا بھی کر سکتی ہے سٹیج پر اس جیسی پذیرائی ہمارے اور کسی گلوکار کے نصیب میں نہیں۔ اور اس کے ہاتھ میں دوسرے گلوکاروں کی مانند کبھی کوئی نوٹ بک نہیں دیکھی گئی۔

لتا منگیشکر اور آشا بھوسلے کے ساتھ ساتھ اُسے بھی شمار کیا جاتا ہے یہ تینوں اپنے اپنے لحاظ سے عظیم ہیں۔ لتا اور آشا کے پرستار دور دراز تک موجود ہیں اور وہ بتم کلاسیکل موسیقی میں ابھی تک سر فہرست ہیں لیکن رونا کی گہری آواز اور ادائیگی کا اندازہ ہے آئندہ دس سالوں میں فلمی گلوکاری میں سر فہرست رکھے گا۔

بنگلہ دیش اور پاکستان رونا لیلیٰ کے فن کے لیے بہت چھوٹے علاقے ہیں۔ اس کے مستقبل کا ملک بھارت ہے اور صرف بھارت ۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھارت میں کسی پاکستانی ہائی کمشنر نے کہا تھا کہ ہم سے کشمیر لے لو اور ہمیں لتا دے دو میں بنگلہ دیش سے کہتا ہوں کہ فرخا بیراج کا سارا پانی لے لو اور رونا لیلیٰ ہمیں دے دو

ہیرلڈ میکملن

رات کے کھانے کی دعوت ساڑھے سات بجے ہے. مہمان خصوصی کی عمر ۸۳ سال ہے اور وہ زیادہ دیر تک جاگ نہیں سکتا۔ وہ ایک گھنٹہ دیر سے آیا ہے شاید اس لیے کہ وہ شراب نہیں پیتا اور دوسروں کو موقع دیا ہے کہ وہ کھانے سے پہلے کچھ پی پلا لیں۔ وہ گہرے رنگ کے خوبصورت سوٹ میں ملبوس ہے اور اس کے ہاتھ میں بڑی سمارٹ سی بید کی چھڑی ہے جس پہ ایک سلور کی پلیٹ لگی ہے جس پر ان لوگوں کے نام کندہ ہیں جنہوں نے اسے یہ تحفہ دیا ہے۔ اس نے کچھ محنت کی ہے اور ہم سب کے متعلق جانتا ہے۔

" اوہو ۔ مسٹر پالکی والا۔ آئین پر آپ کی بحث کیسی جا رہی ہے۔"

" مسٹر بیسانی ۔ منسٹر شپ کے بارے میں آپ کا فیصلہ میں نے پڑھا تھا۔"

" آنند ۔ !تم بڑے ناول لکھتے ہو۔ لیکن افسوس ہمیں نہیں دیتے۔"

" لکشمن ۔ !تم وکی اور لو کو جانتے ہوں گے۔ وہ بہت اچھے اور دلچسپ کارٹونسٹ تھے"

وہ ایک آرام دہ کرسی میں دھنس جاتا ہے اور اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لیتا ہے۔ وہ بالکل اپنے کارٹون کے مطابق نظر آنے لگتا ہے جو لوگوں نے اس کے متعلق بناتے ہیں۔ اس کی آنکھیں چینیوں کی مانند ہیں، صرف باتیں کرتے ہوئے کھلی نظر آتی ہیں باقی اوقات میں وہ سویا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی مونچھیں بہت اور برطانوی اپر کلاس کی طرح ہے ۔ کیا ؟ اچھا ۔ ہاں ۔ سکاچ ۔ سوڈا ملا کر شکریہ ۔ بس اس سے زیادہ نہیں ۔

ہم اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ ایمرجنسی یا اندرا گاندھی کے بارے میں کچھ

نہیں کہے گا۔ یہ مناسب نہیں۔ چرچل نے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی سیاسی بیان نہیں دیا اور چرچل ایک دلچسپ وزیراعظم تھا۔ اس لیے ہم دوسرے موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں" آپ کے زمانے میں مشہور مقرر کون کون تھے۔" وہ بہت کم جواب دیتا ہے۔ وہ اپنا کوٹا ختم کر چکا ہے اور ۲/۱ ۹ بجنے والے ہیں اس لیے ہم ڈرر کی میز کی طرف چل دیتے ہیں۔ وہ میرے سامنے والی میز پر بیٹھا ہے۔ لیکن پھر بھی میں پاکی والا سے اس کی گفتگو نہیں سن پاتا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ہر پانچ چھ منٹ سے بعد وہ اپنی میزبان مسز پیٹرز کی طرف مڑ کر اطمینان کر لیتا ہے۔ کہ وہ قریب ہی بیٹھی اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ سوپ کے دوران شیری کے گھونٹ بھی لیتا ہے کھانے کے بعد ہم دوسرے کمرے میں کافی یا شراب کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں وہ تھوڑی سی برانڈی لیتا ہے۔ اور ہوانا نامی سگار سلگا لیتا ہے۔

"تم مجھ سے اچھے مقرروں کی بابت پوچھ رہے تھے۔" وہ گفتگو کا ٹوٹا سلسلہ جوڑتا ہے۔ "ہاں تو چرچل۔ اس کی تمام تقاریر مجھے ازبر ہیں۔ اینورن بیون بھی اچھا تھا۔ ارنسٹ بیون بھی کام کی باتیں کرتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی لائڈ جارج اور اس کو تھ کا ہم پلہ نہیں تھا۔ جب میں نے پارلیمنٹ میں پہلی تقریر کی تو میرا خیال تھا کہ میں نے بڑا کام دکھایا ہے۔ لائڈ جارج نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ تمہاری تقریر تو اچھی تھی لیکن عوام میں سے کوئی بھی اس کا نوٹس نہیں لے گا تم نے بیس نکات پیش کیے۔ اچھا ہوتا اگر تم ایک ہی نقطہ بیان کرتے۔ ہر ممبر کو دوسرے ممبر سے ہی توقع ہوتی ہے۔ دو وزیر کابینہ کی طرف سے اور تین وزیراعظم کی طرف سے اور بس۔"

وہ اپنے تبصرے پر خوش نظر آتا ہے اور پھر یوں محسوس ہوتا ہے گویا نیند کی وادی میں جا چکا ہے جب ساقی اس کا گلاس لینے آتا ہے تو وہ مزید شراب کے لیے گلاس آگے کر دیتا ہے۔ ہم ہندوستانیوں پر آتے ہیں جو اس سے مل چکے ہیں "جناح، اسی گرم مکان میں، اسی کمرے میں اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت

قابل مقرر تھا۔ اور وہ دوسرا وکیل۔ تمہیں شاید نام یاد ہو۔ ڈیسائی ہاں۔ بھولا بھائی وہ بھی بہت اچھا تھا۔"

وائس چانسلر صاحب ایک اور نام سری نواس شاستری، بھارت کا بہترین مقرر یاد دلاتے ہیں مسٹر میکملن آنکھیں اٹھاتا ہے اور جوابا" لکھتا ہے۔

"ہاں۔" او سولڈ موز ہے۔ میں یاد دلاتا ہوں۔ "ہاں۔ ہوشیار لڑکا تھا۔ لیکن وہ شہریت حاصل کرنے میں جلد بازی کرتا تھا۔ پارٹی لیڈر بننے سے پہلے میں نے ۷ سال آخری بنچوں پر گذارے۔ سیاست میں صبر بہت ضروری ہے۔"

"الوک یادل" کوئی یاد دلاتا ہے۔ لیکن مسٹر میکملن اپنے خالی گلاس سے اسے نامنظور کر دیتا ہے۔ گلاس دوبارہ بھرا جا چکا ہے۔

اب رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ فریڈی چپکے اندر آتا ہے اور شوشہ چھوڑتا ہے۔ "سر آپ کب تک بیٹھیں گے۔"؟

"میں۔ دو بجے سے پہلے تک۔"

ہم ناخوش نظریں ملاتے ہیں۔ "پھر تو آپ صبح دیر سے اٹھیں گے۔"

"نہیں میں سات بجے اٹھ جاتا ہوں۔ مجھے زیادہ نیند کی عادت نہیں۔" پس ہم برطانیہ کی سیاست، بھارت کے لیے اس کی محبت اور میکملن کے گھر کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ آدھی رات ہونے والی ہے، پھر برطانیہ کا سابق وزیراعظم تشویش کا اظہار کرتا ہے۔

"آپ میں سے بہت سے لوگ جانا چاہتے ہوں گے۔"

مہمان بادل نخواستہ اٹھتے ہیں" آپ سے مل کر نہایت ہی خوشی ظاہر ہوئی سر" مہمان کہتے ہیں۔

"سر نہیں۔ وزیراعظم کے لیے خطاب حاصل کرنا بہتر نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں چرچل نے اسے کیسے قبول کیا اور ایٹلی نے بھی۔"

اس سے پہلے وہ خطاب قبول کرنے یا نہ کرنے کی بحث چھیڑتا ہم اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے

آندری مال راکس ۔ دھماکہ خیز قوت

ایک عظیم ادبی شخصیت اور ہمہ وقت انقلابی ــــ پیرس میں حال ہی میں موت سے دوچار ہونے والا آندری فرانس کے ادب اور سیاست پر چھایا ہوا تھا ۔ وہ صدر ڈیگال کا نظریہ ساز، اور پوری دنیا میں استحصال کا مخالف تھا ۔ اس نے چین کے انقلابی کمیونسٹوں کا ساتھ نبھایا ۔ سپین کی سول وار میں حصہ لیا ۔ جنگِ عظیم دوم میں فرانسیسی مزاحمت میں شمولیت کی ، اور بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں مدد کی ۔

بین الاقوامی واقفیت عامہ کی بنا پر ۱۹۷۲ء میں اسے نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا ۔ ۱۹۷۴ء میں جب یہ ایوارڈ وصول کرنے بھارت آیا ، تو میں نے اس کا انٹرویو لیا ۔

ایرک ایرکسن نے اپنی کتاب گاندھی کی سچائیاں میں کہیں لکھا ہے ، کہ تحریر سے کہیں زیادہ اہم دو چیزیں ہیں ــــ عمل اور خاموشی ــــ آندری تحریر اور عمل میں یقین رکھتا ہے ، لیکن خاموش نہیں رہ سکتا ۔ انسان اپنے عمل سے جانا جاتا ہے ، وہ کہتا ۔ اس کے ہیرو باعمل لوگ تھے ، ماؤزے تنگ ، ڈیگال ، لارنس آف عریبیا ۔ اس نے نہ صرف ان لوگوں کے متعلق تحریر کیا ، بلکہ اپنی زندگی کے پچھتر سال عملی جدوجہد میں گزارے ، جہاں وہ موت سے کئی بار بال بال بچا ۔ اگرچہ اس نے اپنے بارے میں سچی بات نہیں بتائی ، تاہم وہ ہر جگہ مقبول تھا ۔

مال راکس کے خاندان کا تعلق فلینڈر سے تھا ۔ اُس کا باپ شراب اور مچھلی کا سوداگر تھا ۔ ۱۹۰۱ء میں آندری کی پیدائش ہوئی ۔ آندری کے باپ نے دو دھارے کلہاڑے سے اپنی زندگی ختم کر لی تھی ۔ اس کی پیدائش کے چار سال بعد اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی ، اور وہ اپنی ماں

کے ساتھ رہنے لگا ، جو سبزی کی دوکان کرتی تھی ۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی ۔ اس میں سے دو بیٹے ہوئے ، اور پھر اس نے خودکشی کر لی ۔ آندری کہتا ہے ، میں جانتا ہوں کہ تمام ادیب اپنے بچپن سے محبت کرتے ہیں ، مگر میں نفرت کرتا ہوں ــــ

آندری کی تعلیم کے بارے میں بہت کم علم ہے ۔ اور جو کچھ اس نے خود تحریر کیا ہے ، وہ درست معلوم نہیں ہوتا ۔ تاہم ۱۹۲۰ء میں وہ دریائے سین کے کنارے کتابیں بیچا کرتا تھا ۔ اور ماہنامہ اور ہفت روزوں میں آرٹ پر مضمون لکھا کرتا تھا ۔ اس نے ایک مالدار یہودی دوشیزہ کلارا گولڈ سمتھ سے شادی کی ۔ جس نے طلاق کے بعد اپنے شوہر کی سوانح حیات لکھی ۔

آندری نے اپنی بیوی کی دولت سٹاک ایکسچینج میں لگا دی ۔ کوئی روزگار حاصل کرنے کی بجائے وہ قدیم فنون اور بشریات کا مطالعہ کرتا رہا ۔ جب کبھی اس کی یہودی بیوی شکایت کرتی ، تو وہ کہتا ، آہ و زاری اور چیخنا چلانا تمہاری نظرت بن چکا ہے ــــ

۱۹۲۳ء میں آندری نے پیرس کے ایک تعلیمی ادارے سے قدیم زبانوں کا ایک کورس پاس کیا ۔ اور اپنی بیوی اور دوست کے ساتھ کمبوڈیا چلا گیا ۔ نوم پنہہ میں اپنے قیام کے دوران دونوں دوست انکورواٹ کے ساحل کے قریب ایک علاقے میں گیا ، اور ایک لاوارث بدھ مندر لوٹا ۔ انہیں قید کر لیا گیا ۔ مال راکس کو تین سال قید ہوئی ۔ اپیل کے نتیجے میں یہ دو سال میں تبدیل ہو گئی ۔ اور پھر اس کی بیوی اور دوسرے دانشوروں کی فرانس میں تحریک کے نتیجہ میں ختم ہو گئی ۔ ممنونِ احسان آندری فرانس واپس آیا ۔ مگر اپنی بیوی کے لئے تحفے کے طور پر حشیش لایا ۔

ایک سال بعد مال راکس بھارت کے چینی علاقے میں واپس آیا ، تاکہ حکومت کے ساتھ اپنے جھگڑے نمٹا سکے ۔ اس نے آزادی کی جدوجہد کا معاون رسالہ نکالنا شروع کیا ۔ جس کا نام ہند چینی جرنل تھا ۔ انتظامیہ نے اس پرچہ کو دبانا چاہا ۔ مال راکس نے جواباً ایک کتاب لکھ دی ، ”مغرب کی تحریص“ ، اس میں اس نے نوآبادیاتی نظام کے بخیئے ادھیڑ دیئے ، اور قدیم ثقافت کی تعریف کی ۔ دو سال بعد ۱۹۲۸ء میں اس نے اپنا پہلا ناول ”فاتحین“ ، مکمل کیا ۔ اس میں ۱۹۲۵ء کے فوجی انقلاب

کا ذکر تھا۔ وہ گیلی مارڈ کے باعزت گروہ میں شمار ہونے لگا، اور آندری گائیڈ کا قریبی دوست بن گیا۔ کام کے دوران اُس نے ایران، افغانستان، بھارت، ملائشیا اور چین کا بھی دورہ کیا۔

چین میں اُس کے ناول "انسان کی قسمت"، کو فرانس کے نوبل انعام کے برابر پرکس گون کورٹ انعام ملا۔ ناول کے کرداروں میں اس کی بیوی کلارا بھی ہے۔ جس نے اپنی بے حیائی کا بھی اعتراف کیا، اور ۱۹۳۶ء میں طلاق حاصل کی۔

انعام کی رقم اور کتابوں کی رائیلٹی نے آندری کو اس قابل بنایا، کہ وہ مملکِ عرب جا کر ملکہ شیبا کا شہر تلاش کرے۔ اُس نے اپنی دریافتوں کے متعلق بڑے پُرجوش خط لکھے، جن سے اُس کی تصوراتی دنیا کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۹۳۰ء کے دہاکے میں مالراکس کی صلاحیتیں یورپ میں بڑھتے ہوئے فاشزم کے خلاف جمع ہو گئیں۔ ریسٹاگ میں آگ کی واردات میں دمتری کو بچانے کے لئے آندری اور گائیڈ نے مل کر کام کیا۔ اس کا چوتھا ناول "ڈیز آف ورتھ"، نازیوں کے اذیتی کیمپوں کے بارے میں ہے۔ پھر وہ سپین چلا گیا، جہاں خانہ جنگی پھوٹ چکی تھی۔ اُس نے فرانکو فاشسٹوں کے خلاف سپین کی ایئر فورس کو منظم کیا۔ وہاں اُس نے اپنے ہم نسلوں ہیمنگ وے، ڈان پاسوس، نرودا اور ایلیا اہرن برگ سے ملاقاتیں کیں۔ اہرن برگ نے مالراکس کے بارے میں خیال ظاہر کیا ہے، کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی جذبے کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔

مالراکس نے سپینی زبان میں بیشتر کہانیاں تحریر کیں۔ پھر اس نے اس تجربے کو ایک فلم کی صورت میں ڈھالا۔ اُس نے جو فلم بنائی، اُس کا نام "لا اسپائیر"، یعنی "اُمید"، تھا۔ اُس کا خیال تھا، کہ سپین کا انقلاب اُمید کا ہی اظہار تھا۔ بیٹی کی پیدائش کے تین سال بعد اس کی یہودی بیوی کلارا نے اُسے طلاق دے دی، تو مالراکس نے جوسے کلاٹس نامی ایک ٹیچر سے شادی کر لی۔ دونوں فرمانبردار سپین کے کاز کی خاطر ریاست ہائے متحدہ امریکہ روانہ ہوئے۔ فرانکو جیت گیا۔ اور دوسری جنگِ عظیم نے ناگزیر حیثیت اختیار کر لی۔

مالراکس کے مطابق فاشزم کا مطلب شیطان کی واپسی تھا۔ وہ خفیہ طور پر جنگ میں شامل ہوا۔ جرمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ لیکن جیل سے بھاگ کر فرانس کے جنوبی علاقے میں اپنی بیوی سے جا ملا۔ اُس کا ناول "دی والنٹ ٹریز آف ایلٹن برگ"، فاتح جرمنوں کے ذہنی انقلاب کے بارے میں ہے۔ یہ تبدیلی جرمنوں میں اُس وقت آئی، جب وہ گیس کو بطور ہتھیار استعمال کر چکے تھے۔ جب فرانس کو شکست ہو گئی، تو مالراکس ماکویٹس کی مزاحمتی تحریک میں شامل ہو گیا۔ جرمنوں کے ساتھ ایک مقابلے میں اس کا ڈرائیور مارا گیا، اور وہ خود زخمی ٹانگ سمیت قید ہو گیا، اور اسے موت کی سزا سُنائی گئی۔ اُسے ایک فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، جس نے اس پر خالی فائر کیے۔ اپنے اس تجربے کو اس نے اپنی کتاب "اینٹی میموریز" میں بیان کیا ہے۔

جب جرمن چلے گئے، تو وہ جیل سے رہا ہوا، اور باہر آتے ہی اُس نے مارکوئیس کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ آندری مالراکس اپنے دو سوتیلے بھائیوں کو کھو کر "آزادی کا کراس"، اور "کروشے ڈی گورے"، حاصل کر چکا تھا۔ ایک شدید المیہ ابھی باقی تھا۔ ۱۹۴۴ء میں دو بیٹوں کو جنم دینے والی جوسے کلاٹس ایک ریل حادثے میں ہلاک ہو گئی۔

جنگِ عظیم کے اختتام پر مالراکس کا انقلابی جوش و جذبہ سرد پڑ گیا۔ اُس نے جنرل ڈیگال کی عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت قبول کر لی۔ بعد میں اُس نے وضاحت کی، کہ اُس کے جوانی کے نظریات اور موجودہ نظریات میں بڑا فرق ہے۔ "میں نے پرولتاریہ کو فرانس سے بدل لیا ہے"۔ اُس نے کہا۔ کہ معیاروں کی بجائے کارسیاگیوں کو ترجیح دی۔ ڈیگال کی صورت میں اُسے جنگِ آزادی کے ہیرو اور نوآبادیات کے خلاف ایک شخص کی سی شخصیت ملی۔

اس کے نزدیک ڈیگال ازم کا مطلب فرانس کی خدمت تھا۔ جنرل ڈیگال نے بھی مالراکس کو اپنا دایاں ہاتھ کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ ڈیگال کے بقول مالراکس کی موجودگی اُسے ہر مشکل سے بچاتی تھی۔

ڈیگال کی ریٹائرمنٹ کے دوران مالراکس نے "وائس اور سائی لینس"، امیجنری میوزیم اور میٹامارفسس آف گاڈز مکمل کیں۔ ۱۹۵۸ء کے موسمِ بہار میں جب ڈیگال پھر برسرِ اقتدار آیا، تو مالراکس اُس کی حکومت میں ثقافتی امُور کا وزیر بن گیا۔ جنرل اور اس کے ساتھی دانشور نے الجزائر سے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کرنے کی تدابیر کیں۔ فرانسیسی فاشسٹوں کے ہاتھوں مالراکس پر کئی بار قاتلانہ حملے بھی ہُوئے، لیکن وہ محفوظ رہا۔

اپنے ملک کی ثقافتی حالت کو آندرے مالراکس سے زیادہ بہتر کسی وزیرِ ثقافت نے نہیں بنایا۔ اُس نے پیرس کے چہرے سے میل اور کالک اُتار کر اُسے ہیرے کی طرح چمکا دیا۔ اس نے فوجی تھیٹر کی تنظیمِ نو کی، اور دُنیا بھر میں خیر سگالی دوروں پر گیا۔ وہ گیارہ سال تک وزیر رہا۔

موت کُتّے کی طرح مالراکس کے قدم سُونگھ رہی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں اُس کے دونوں بیٹے اذیت ناک موت کا شکار ہُوئے۔ اس کی دوسری شادی جو اس نے اپنے سوتیلے بھائی کی بیوہ سے کی تھی، علیحدگی پر ختم ہُوئی۔ دل بہلانے کی خاطر اُس نے مصر، بھارت اور چین کا جبری سفر کیا۔ مالراکس کے اندر سلگتی آگ، بیماری، طویل عُمری، شکستہ رشتوں اور ذاتی المیوں کے باوجود کم نہ ہُوئی۔ ۱۹۷۱ء میں سبعینی (عہدِ عتیق کا یونانی نام اُن لوگوں کے لئے جو قدیم عہد نامہ کو مانتے ہیں) مالراکس نے پاکستانی فوجوں کے تشدّد کی مذمت کی، اور بنگلہ دیش کے آزادی کے جیالوں کی مدد کرنے کی پیشکش کی۔

میری مالراکس سے ۱۹۷۴ء میں کلکتہ میں مُلاقات ہُوئی، جب وُہ نہرو ایوارڈ حاصل کرنے آیا۔ یہ انٹرویو بمبئی کے گورنر نواب علی یاور جنگ اور فرانسیسی سفیر مسٹر جین ڈینیئل جرگنس کی کوششوں سے طے ہُوا۔ میں اُس سے ملنے میں ہچکچاتا تھا۔ ایک تو میں نے مالراکس کا مطالعہ بہت کم کیا تھا اور دوسرے مجھے علم تھا، کہ تمام فرانسیسی دانشوروں کی طرح وہ بھی فرانسیسی میں ہی گفتگو کرتا ہے۔

موت کے ساتھ اس کے بے شمار تصادم میرے ذہن میں تھے۔ اس کی یہودی بیوی کی بے وفائی، اور بعض عورتوں کے ساتھ اس کے مراسم (یہ بھی معلوم ہُوا تھا، کہ ۱۹۷۲ء میں اُس نے ایک مالدار وارثہ سے شادی کی تھی) کی خبریں بھی تھیں۔ لیکن بھارت میں اُس کی ہم سفر ایک نوجوان خاتون تھی۔ میں اُس کی عظیم شہرت سے بھی متاثر تھا۔ میں گھبرایا گھبرایا سا راج بھون میں داخل ہُوا۔ انٹرویو کے وقت جو خود اعتمادی عموماً میرے اندر موجود ہوتی ہے، مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔

مالراکس کا چہرہ اُس کی جوانی کی یادگاریں لئے ہُوئے تھا، اُس کی آنکھیں سُوجی ہُوئیں اور چہرہ کھنچا ہُوا لگتا تھا۔ وہ بہت تیز بولتا تھا، اور اس کی زبان گڑبڑا جاتی تھی۔ مجھے بات سمجھنے کے لئے اکثر سفیر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا۔ اس عظیم انسان کے ساتھ جو گفتگو ہُوئی، اس کا مختصر حال یُوں ہے۔

سوال :۔ آندرے گائیڈ نے ایک جگہ لکھا ہے، کہ ادیب و شاعر ہمیشہ زندگی اور موت کے مسائل میں اُلجھے رہے ہیں۔ آپ کی اپنی زندگی میں موت کی بہت سی ستم ظریفیاں رہی ہیں اور آپ نے ایک خطرناک زندگی گذاری ہے۔ میں اس فلسفۂ موت کے متعلق آپ کا نظریہ جاننا چاہتا ہُوں۔ ہندوؤں کا نظریہ کچھ اور ہے، اور عیسائیوں کا کچھ اور۔ یعنی ہندو زندگی، موت اور دوبارہ زندگی یعنی آواگون پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آپ یقیناً نہیں رکھتے ہوں گے؟

جواب :۔ میری بہت سی تحریروں میں موت بحیثیت ایک مضمون کے آئی ہے۔ لیکن جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے، کہ حیات بعد الموت کے بارے میرا کیا خیال ہے، تو میں جواب دیتا ہُوں، کہ میں اس سوال کو فلسفیانہ طور پر سمجھ نہیں پاتا۔ اگر میں اپنے آپ کو مذہبی لوگوں میں شمار کروں، تو میں سوال کو پوری طرح سمجھ لیتا ہُوں۔ بصورتِ دیگر گفتگو بے معنی ہے۔ ہم عیسائیوں سے نہیں پوچھتے، کہ کیا وہ زندگی کو دائمی سمجھتے ہیں۔ اگر مذہبی لوگوں سے پوچھا جائے تو یہ نظریہ جیسا کہ میں نے اپنی آخری کتاب میں بیان کیا ہے، لاحاصل ہے۔ ہمارا سوال ہونا چاہیئے، کہ حیات بعد الموت اور نا حیات بعد الموت میں کیا فرق ہے۔ تناسخ یا عدم تناسخ میں کیا فرق ہے۔ میں تناسخ میں بالکل یقین نہیں رکھتا۔ جو کچھ اس زندگی سے باہر ہے، یعنی جنہیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اصل میں ہمارے خیالات اور عقل کی پہنچ سے باہر ہیں۔ ہاں

اتنا ضرور کہوں گا، کہ میں رُوحوں کے تناسخ کا قائل ہُوں۔ اور یہ نہایت مدلل بات ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے، کہ وہ مذہب سے الگ ہو کر حیات بعد الموت کا قائل ہے، تو وُہ بیوقوف ہے۔

سوال:۔ آپ موت کے اتنا قریب رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، کہ آپ نے موت پر کیسے قابو پایا؟

جواب:۔ یہ میری پچیس سالہ ریاضت کا نتیجہ ہے۔ اس عرصے کے دوران موت مجھ پر اتنی دفعہ حملہ آور ہُوئی، کہ مجھے اس کی آمد پر حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ موت کا خوف۔ میں اسے ایک اور طریقے سے واضح کرتا ہُوں۔ موت کے نظریئے کی دو پرتیں ہیں۔ ایک تو طبعی طور پر مر جاتا ہے۔ دوسری موت کی، بعد الطبیعات۔ میں موت کے بعد الطبیعاتی، نظریئے پر سوچ بچار کرتا ہُوں۔ لیکن اپنے طبعی انجام سے بالکل لاپرواہ ہُوں

سوال:۔ موت میرے قریب سے کبھی نہیں گذری۔ پھر بھی میں اس سے خوفزدہ ہُوں لیکن آپ ایک ادیب ہیں، اور پھر موت کا تجربہ بھی آپ کو ہے۔ کیا آپ بتائیں گے، کہ آپ موت سے کیوں خوفزدہ نہیں، جبکہ میں ہُوں؟

جواب:۔ مذہبی اعتقاد کی بنیاد پر تناسخ کا قائل ہو جانے اور مغرب کے نظریئے پرواز روح سے ذہنی سکون حاصل کر لینے میں فرق ہمارے سامنے ہونا چاہیئے۔ مغربی سائیکاٹرسٹ کہتے ہیں، کہ انسان غیر شعوری طور پر اس بات پر یقین رکھتا ہے، کہ مرنے کے بعد وہ لاشوں کی صورت میں ہوں گے۔ یہی وجہ ان کے لیئے موت کا خوف پیدا کرتی ہے۔

سوال:۔ کسی نامعلوم ہستی کا خوف تو دنیا کے تمام مذاہب میں ہے؟

جواب:۔ یہ ذہنی کوفت کا نظریہ ہے۔ جسے کیرک گارڈ نے پیش کیا، اور اسے خدا کے مقابلے میں رکھا۔ لیکن میرا ذاتی نظریہ ہے، کہ ذہنی کوفت نامی چیز خالصتاً مابعد الطبیعاتی نہیں ہے۔ ذہنی کوفت کا باعث خارجی عناصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب پر اعتقاد

یہ سوچنا، کہ مرنے کے بعد ہم لاش میں تبدیل ہو جائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرا خیال نہیں کہ آٹھویں صدی کے ہندوستانی موت سے ذہنی طور پر خوفزدہ تھے، اور نہ ہی قدیم روم کے باشندے ایسا سوچتے تھے۔

سوال:۔ یہ صرف موت کا ہی خوف نہیں، بلکہ موت کے خوف کے ساتھ ساتھ تکلیف کا خوف بھی مجھے پریشان کرتا ہے؟

جواب:۔ یہ ایک الگ سوال ہے۔ ایک پہلو ایسا ہے، جس میں مجھے کوئی تجربہ حاصل نہیں ہُوا، اور وہ ہے تکالیف۔ موت کے تازہ ترین حملے میں بھی مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہُوا۔ میں کئی دفعہ زخمی ہُوا ہُوں۔ لیکن زیادہ تکلیف محسوس نہیں کی۔ کبھی میرے معدے میں گولی نہیں لگی۔ بازو نہیں ٹوٹا۔ میں نے کئی جگہ پڑھا ہے، کہ تکالیف موت کا عروج ہیں لیکن میں ایسے کسی تجربے سے نہیں گذرا۔

سوال: آپ کی ساری زندگی اس امر کی گواہی دیتی ہے، کہ آپ نے ڈرائنگ روم کی نسبت انقلابی جد وجہد میں زیادہ آرام محسوس کیا ہے۔ آپ نے اپنی کئی تحریروں میں اس حوالہ بھی دیا ہے۔ کیا اب بھی ایسا ہی ہے؟

جواب:۔ حقیقی طور پر تو انقلابی تحریکات نہیں ہیں۔ گو بیرا کی طرح انقلابی شخصیات ضرور موجود ہیں۔ تمہارے ملک میں انقلاب آزادی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس وقت حقیقتاً آپ انقلابی تحریک چلا رہے تھے۔ اب روس میں جو تبدیلی آئی، اُسے انقلابی تحریک کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن برزنیف اور لینن کے اقوال میں بہت زیادہ فرق ہے۔ بھارت میں کانگرس اب وہ قوت نہیں رہی، جو گاندھی کے جیل جانے کے دوران تھی۔

سوال:۔ میرے خیال میں دنیا کی آئندہ جنگ نسلی امتیاز کی بنیاد پر ہو گی۔ جیسا کہ جنوبی افریقہ میں کالوں اور گوروں کے درمیان ہُوا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا انقلاب ہے۔ کچلے ہُوئے کالے لوگوں کا۔ آپ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

جواب :- میرے خیال میں اعلیٰ ترین ترقی یافتہ اقوام اس مسئلے سے باخبر ہیں۔ اور اس قسم کے حادثے سے پہلے ہی کوئی تدبیر سوچ لیں گی۔ ہو سکتا ہے، کہ تیسری دنیا اور سرمایہ داری میں کوئی مفاہمت ہو جائے۔ مثلاً وہ یہی سوچ لیں، کہ پیٹرول کے موجودہ ذخائر صرف بیس سال تک پیداوار کے قابل ہیں۔ تبدیلی ضرور آئے گی، اور اسے آنا چاہیئے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ بڑی طاقتیں جانتی ہیں، کہ موجودہ نظام غلط ہے۔ لیکن اس میں تبدیلی لانے کے لئے ان کے پاس اٹھارہویں صدی کی جمہوری روایات کے علاوہ کچھ نہیں۔ سوال یہ ہے، کہ آیا ہم نئے طریقے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہی اس صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

انقلابی دھارے کے نظریہ کو بھی رد نہیں کرتا۔ یہ ہو سکتا ہے، کل جنوبی افریقہ میں لاکھوں ہزاروں اموات ہو جائیں۔ بیافرا میں بھی لاکھوں افراد مارے جا چکے ہیں۔ بنگلہ دیش میں بھی۔ مگر ان لاکھوں افراد کے مار دیئے جانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ مغرب جس نے سائینس کی ترقی کی بدولت دنیا پر فتح حاصل کی، دُنیا کو درست رکھنے کے لیئے کوئی نظریہ نہیں رکھتا۔ مغرب صرف اقوام متحدہ کے ذریعے دنیا کے ممالک کو متحد رکھنے کے نظریئے پر اڑا ہوا ہے۔ میرے ذاتی خیال کے مطابق یہ سراسر حماقت ہے۔

سوال :- کیا آپ گذشتہ سال کے اپنے بیان کی وضاحت کریں گے۔ جس میں آپ نے کہا تھا، کہ بھارت اور چین کے درمیان اقتصادی ترقی کے میدان میں اختلافات شدید تر ہو جائیں گے؟

جواب :- ماؤزے تنگ کی موت کے بعد اہم تبدیلیاں ہوں گی۔ لینن کی موت کے بعد روس میں تبدیلی آئی۔ تردیگا اور ٹراٹسکی کے بعد کیا ہوا۔ میں نہیں جانتا، کہ ماؤ کے بعد چین میں کیا ہو گا۔ لیکن تبدیلی ضرور آئے گی۔ اس سے زیادہ میں بھارت اور چین کے تعلقات کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا۔

سوال :- آپ نے ایک نہائیت خوبصورت بات کی، کہ ہر کسی کو دنیا میں ایک مثال چھوڑ جانی چاہیئے۔ آپ کے خیال میں آپ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟

جواب :- میں نے اپنے بارے میں یہ تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو میرے ناول " دی ہیومن کنڈیشن میں ایک کردار نے کہا تھا۔

سوال :- میرا خیال تھا، کہ یہ آپ کا فلسفہ ہے۔ ادیب دوسرے کے ذریعے ہی اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں؟

جواب :- یہ درست ہے، مگر وہ کردار ۱۹۳۳ء کا کردار تھا۔

سوال :- اس کا آپ کی ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں؟

جواب :- ۱۹۳۳ء میں جب میں نے یہ لکھا، تو اس وقت میرے سامنے ہٹلر تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے، کہ اس وقت جو لکھا گیا، اس کے پیش نظر فاشزم تھا۔ میں کمیونسٹ نہیں تھا۔ اور نہ ہی بائیں بازو کے اتحاد کا انحصار کمیونزم پر تھا۔ درحقیقت یہ فاشزم کے خلاف اتحاد تھا۔ اب چونکہ فاشزم نہیں ہے، اس لئے سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔

سوال :- اس کے باوجود کیا اب آپ یہ نہیں چاہتے، کہ دنیا میں کچھ یادگار چھوڑ جائیں؟

جواب :- یقیناً۔ لیکن ویسا نہیں۔ ایک وقت تھا، جب عظیم لوگ ایسا کرتے تھے۔ مگر جنگ کے بغیر تو شائد چرچل بھی ایک بے کیف شخصیت ہوتا۔ جنگ کے بغیر تو شائد جنرل ڈیگال بھی ایک عام جرنیل ہوتا۔ اور ہٹلر صرف ایک احتجاج کنندہ ہوتا۔ ہمارا زمانہ جنوں کا زمانہ تھا، مگر انہیں جن جنگ نے بنایا تھا۔ اب ان کا نشان بھی نہیں۔ یادگار چھوڑ جانے کا نظریہ اب محض انگلی کٹوانے کی بات ہے۔ اور اس میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

سوال :- ایرک ایرکسن نے گاندھی جی کے بارے ایک کتاب لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے، کہ صرف دو چیزیں اہم ہیں۔ عمل اور خاموشی۔ آپ اس پر کیا تبصرہ کریں گے؟

جواب :- میرا خیال ہے، کہ اس بڑے بیان کے اندر کچھ نہیں۔ ہیر پھیر کر مطلب نکلتا ہے،

کہ خاموشی اور عمل، تحریر سے زیادہ اہم ہیں۔ مگر میرا سوال ہے، کہ کیسی خاموشی؟ کیسا عمل؟ کیسی تحریر؟ جب عمل کرنے والا اسکندرِ اعظم ہے، تو عمل عظیم ہے۔ جب اس پر فتوحات کا دورہ پڑتا ہے، تو وہ لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ خاموشی ۔ خاموشی تو پھر اسباد کی ہے۔ لیکن اگر خاموشی بچے کی سی ہو، تو پھر؟

سوال:۔ میں آپ کی تحریروں کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ ہاتھ سے لکھتے ہیں، یا ٹائپ کرتے ہیں، یا اپنا مسودہ ڈکٹیٹ کرواتے ہیں۔ اور کیا لکھنے کے بعد نظرِ ثانی بھی کرتے ہیں؟

جواب:۔ نہیں۔ میں ڈکٹیٹ نہیں کرواتا۔ میں اپنے کام پر بہت زیادہ نظرِ ثانی کرتا ہوں۔ خاص طور پر مکالموں میں۔ اس لحاظ سے ANTIMEMORIES بہت مشکل کتاب تھی۔ مثلاً نہرو کے ساتھ گفتگو کو بیان کرتے ہوئے میں نے اس کردار کے اصل الفاظ اسے دینا تھے۔ بصورت دیگر وہ میرے اندازِ گفتگو سے مشابہہ ہوتے۔ میرے لئے ایک ہی راستہ تھا، کہ میں اس کی باتیں غور سے سنوں۔ پھر یہ بھی، کہ میں تلفظ کی صحت کا خیال رکھوں۔ اور صرف نقل ہی نہ کروں۔ اس سب کے لئے محتاط نظرِ ثانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال:۔ کیا یہ درست ہے، کہ سپین کی خانہ جنگی پر آپ کا ناول ایک ہفتے میں مکمل ہو گیا تھا؟

جواب:۔ یہ واقعی سب سے کم عرصہ میں لکھا گیا۔ مگر پھر بھی پانچ ماہ سے اُوپر صرف ہوئے۔

سوال:۔ میرا یقین ہے، کہ جسمانی اور ذہنی قوتوں کے درمیان کچھ مشابہت ہوتی ہے۔ اور آپ کی شخصیت سے یہ ثابت ہوتا ہے

جواب:۔ اچھا میں آپ کو اس انٹرویو کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور آپ کی تحریروں کے لئے نیک تمنا کا اظہار کرتا ہوں۔

سوال:۔ میری کتابیں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتیں۔

جواب:۔ یہی والٹیر نے کہا تھا، "میری کتابیں سنجیدہ نہیں ہوتیں۔"

کرشنا مینن ۔ اکیلا بھیڑیا

اب کرشنا مینن کے بولنے کی باری تھی۔ اُس کے پیشرو کے حصے میں تالیاں آئی تھیں، اور ظاہراً مجمع ٹوٹ چکا تھا۔ کرشنا مینن ایسے لوگوں سے نفرت کرتا تھا، جو اس کی موجودگی میں مجمع توڑ لیں۔ وہ ناراض اور ناخوش نظر آتا۔ وہ مائیکرفون کو کھینچتا، ملیالی زدہ انگریزی تلفظ میں چند فقرے بڑبڑاتا، اور پھر میز پر گر جاتا۔ جلسہ برخواست ہو جاتا۔ ایک ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی کرشنا مینن کو کسی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرف لے اُڑتی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ انڈیا ہاؤس میں اپنے کمرے میں موجود ہوتا۔ اُس کا ذاتی معالج ڈاکٹر بھٹاچاریہ جی (بنگالی وزیرِ اعلیٰ کی ایم پی اے بیوی مسز سدھارتھ شنکر رے کا باپ) اسٹیتھوسکوپ کی مدد سے اس کی چھاتی ٹٹولتا۔ کمرہ مزاج پرسی کرنے والے دوستوں، چائے اور قہقہوں سے بھرا ہوتا۔

اگلے روز کے اخبار کرشنا مینن کے متعلق سرخیوں سے بھرے ہوتے، اور جلسے کی کارروائی کو بے انتہا کوریج ملتی۔

پھر گارڈین میں موجود گائی وِنٹ مجھے فون کرتا ۔ "ہمارے پاس خبرِ مرگ لکھنے والا کوئی نہیں۔ کیا تم مُردہ شناسی کر سکتے ہو۔؟" میں جواب دیتا، کہ مستقبل میں کرشنا مینن کے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اُسے کئی دفعہ گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن اگر مجھے لکھنا ہی پڑا، تو اس کی سوانحِ حیات لکھوں گا۔ اخباروں میں آنے والی یہ خبریں ہمیشہ مجھے کاٹ کر بھیج دی جاتیں، تاکہ میں معلومات اَپ ٹو ڈیٹ رکھ سکوں۔

١٩٦٢ء تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ پھر اس میں کچھ اضافہ ہوا۔ چینیوں نے نہ صرف ہماری دفاعی مشینری کا منہ کالا کیا، بلکہ اُنہوں نے کرشنا مینن کا نام اوراقِ تاریخ سے بھی مٹا دیا۔

١٩٤٧ء سے لے کر ١٩٦٢ء تک پورے پندرہ سال ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر کم از کم ایک کالم ایسا ضرور ہوتا، جس میں کرشنا مینن کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات شائع ہوتی۔ پھر وہ اچانک شہرت کے اس مینار سے گر گیا، اور اس کی یاد محو ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ جس خراجِ تحسین کا وہ حقدار تھا، خدا نے اسے وہ بھی نہ دیا۔ اسے علی الصبح سوا دو بجے بلا لیا گیا۔ اور دنیا کا آخری میلہ بھی نہ دیکھ سکا۔ ہمارے اخباروں کے صبح کے ایڈیشن اس کی بحالیٔ صحت کی خبریں دے رہے تھے، اور شام کے اخباروں نے اسے صرف آدھا کالم ہی دیا۔ وہ دنیا کے ہر اخبار میں سیاہ حاشیے میں پہلے صفحے کا حقدار تھا۔ جب میں اس کی ملازمت میں تھا، تو اس وقت ہندوستانی پریس میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ بہت سے غلط لوگ اس کے گرد تھے، جس میں نہرو کے نیشنل ہیرلڈ کا چالاپاتھی راؤ، آر کے کرنجیا، اور اس زمانے کا مقبولِ عام ہفت روزہ بلٹز کا ایڈیٹر وغیرہ۔ بھارت کے تمام صحافیوں کی بنیاد لندن میں تھی۔ ایلک، ایلا ریڈ (ہندوستان ٹائمز) سندر کابادی، تارپدیا گھو، تاہم مگر سب کے سب اس کے دشمن۔ وہ اپنا پی۔ آر۔ او خود تھا۔ صاف ظاہر تھا، کہ اُس نے کارنیگی کی کتاب "دوست کیسے بنائیں" ہرگز نہیں پڑھی تھی۔

١٩٣٠ء میں جب میں لندن یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، اس وقت سے میں اُسے جانتا تھا۔ اس نے انڈیا لیگ کی بنیاد رکھی تھی، جس میں انگریز مرد اور عورتیں شامل تھے، جو بائیں بازو کے خیالات سے متاثر تھے، اور کرشنا مینن کے لئے یا اس کے حوالے سے بھارت کے کام کر رہے تھے۔ اور بھی بہت سی تنظیمیں بھارت کی آزادی کے لئے کام کر رہی تھیں، لیکن انڈیا لیگ سرِفہرست تھی۔ باقی تنظیموں کے سربراہ ڈاکٹر، وکیل یا سرمایہ دار تھے، جن کے پاس وقت سے زیادہ سرمایہ تھا، جو اس تحریک میں صرف کر رہے تھے۔ کرشنا مینن

کے پاس پیسہ تو بالکل نہیں تھا، لیکن وقت کی کمی نہیں تھی۔ اسے بار میں کھانے پر مدعو کیا جاتا، جہاں سب لوگ ڈنر جیکیٹس پہن کر آتے۔ اُس نے کبھی قانون کا مطالعہ نہیں کیا تھا، اور نہ ہی ایک دھیلے کی وکالت کی۔ اس کا دل قانون کی بجائے سیاست کی طرف راغب تھا۔ احتجاج کی تحریک میں اس کی کامیابی کا راز، مقصد کی پہچان تھا۔ اگر آپ ہند کی آزادی کے خواہاں ہیں، تو آپ کو کرشنا مینن کی مدد کرنا ہوگی، اس کے علاوہ آپ کسی کی مدد کر کے محبِ وطن نہیں کہلا سکتے۔

ٹرائگل سکوائر کے قریب تاریک اور غلیظ دفتر میں ہم درجنوں ہندوستانی طالبعلم پوسٹر فولڈ کرتے لفافوں میں ڈالتے، ٹکٹ لگاتے، اڈریس لکھتے اور پھر پوسٹ بکسوں میں ڈالا کرتے۔ کرشنا مینن نے کبھی کسی کا شکریہ تک ادا نہ کیا، کیونکہ اس کے خیال میں ہم اس کے حقدار نہ تھے۔

اگر آپ انگلینڈ جائیں، تو آپ کو کئی ایسے لوگ ملیں گے، جو بتائیں گے، کہ انہوں نے کرشنا مینن کے کھانے کے پیسے دیئے، اس کے مکان کا کرایہ ادا کیا، اسے لباس مہیا کیا، لیکن شکریے کا ایک لفظ اُن کے حصے نہ آیا۔ اور اگر کسی نے کرشنا کو یاد دلانے کی کوشش بھی کی، کہ اس نے کرشنا کے لئے کیا کچھ کیا ہے، تو یا تو اس نے اس کی بات نظر انداز کر دی، یا پھر اسے سخت سُست کہا۔ اس ناشکرے پن کے الزام نے کرشنا مینن کو کبھی پریشان نہیں کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا، کہ اسے دیا جانے والا چائے کا ایک کپ بھی ہندوستان کی آزادی کی خاطر دیا جا رہا ہے۔

خواتین کرشنا مینن کو خوبصورت مان ہی لیتی تھیں۔ اس میں کسی ہندوستانی فلمسٹار کی سی خوبصورتی نہیں تھی۔ وہ مفسطاخلیز کی مانند زیادہ لگتا تھا۔ غصے سے بھری سُرخ آنکھیں، لہراتے ہوئے سفیدی مائل بال، اُونچی پیشانی، جس پر دونوں طرف دو نشان، جو یوں معلوم ہوتے تھے، کہ کسی زمانے میں شیطان کے سینگ تھے۔ اور اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک

ناراض سی لکیر ابھرتی۔ وہ ہمیشہ بے داغ اور نفیس لباس پہنتا۔ برف سے زیادہ سفید ملیالی منڈو اور قمیض، اور سنہری حاشیئے والی انگاوستر (لباس کا نام)۔ وہ جہاں بھی جاتا، یہی سمجھتا، کہ اس جیسا رُوئے زمین پر اور کوئی نہیں۔ شیکسپئر کے کاسیس سے کرشنا کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ شیکسپئر نے کاسیس کے بارے میں لکھا تھا کہ "دُبلا پتلا اور بھوکی نظروں والا کاسیس بہت زیادہ سوچتا تھا، اور ایسے لوگ خطرناک ہوتے ہیں"۔

کرشنا مینن زندگی کے اچھے لوازمات کا دلدادہ تھا۔ جب وہ اس قابل ہوگیا، کہ اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرسکے، تو اس کے ضمیر نے کچوکے دینے شروع کردیئے۔ اس نے بڑی محنت اور لگن سے پہلے برسوں میں ایک عیش پرست فاقہ کش کی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔ اس نے اپنی تنخواہ جمع کی، ان خبروں کی تردید نہ کی، کہ وہ تنخواہ نہیں لیتا۔ اور ہائی کمشن کے ایک کمرے میں قیام کیا۔ اُسی وقت اس نے کاروں کے ایک بیڑے کا حکم دیا، جس میں ایک رولز رائس، اُس کے ذاتی استعمال کے لئے بھی تھی۔ مینن کی طرح کبھی کوئی وزیر دفاع کاروں اور موٹر سائیکلوں کے جلوس میں سڑکوں پر نہیں دوڑا۔ جب وہ وزیر نہ رہا، تب بھی وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا، لندن اور نیویارک کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں ٹھہرتا رہا۔ صرف کھانے پینے میں اُس نے سادگی برقرار رکھی۔ وہ بہت کم کھاتا تھا۔ یا بادام، یا دال یا نمکین بسکٹ۔ وہ ویجیٹیرین تھا۔ بیس سے تیس کپ چائے روز پیتا تھا۔ اور سونے کے وقت چائے میں لیموں نچوڑ کر پینا، اس کا بہترین مشروب تھا۔

مینن کی ذہانت پر بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ لیکن اس کی تعلیمی رپورٹ یا بحیثیت وکیل کارکردگی میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کی یہ صلاحیت سنہ ۱۹۴۶ء تک پوشیدہ رہی، اور پنڈت نہرو نے اسے دریافت کیا۔ مینن میں انتظامی صلاحیت بہت کم تھی۔ وہ اکثر اوقات چیزوں کا توازن بگاڑ دیتا تھا۔ پنڈت نہرو نے اس کی سرپرستی کی۔ پنڈت نہرو ایک مشفق باپ کا کردار ادا کرتے رہے، اور کرشنا مینن ایک

بگڑے ہوئے بچے کا۔ جو ہر ناپسندیدہ شخصیت کے منہ پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کردیتا، یا اس پر تنقید کرتا۔

وہ کمال بے خوفی سے سینئر سول سرونٹس اور فائیو سٹار جرنیلوں کی بے عزتی کر دیتا۔ دھمکی کے طور پر استعفیٰ دے دیتا، اور پھر واپس لے لیتا۔ مسز نہرو کا مذاق اُڑاتا۔ پنڈت جی کے پرائیویٹ سیکرٹری کو گالیاں دیتا۔ حتیٰ کہ کابینہ کے وزیروں کو اَن پڑھ گاؤدی سمجھتا۔ پیرس میں ایک میٹنگ کے دوران اُس نے بھارت کے سفیر سردار ایچ ایس ملک کو اتنا ذلیل کیا، کہ ہاتھا پائی کی نوبت آتے آتے رہ گئی۔ سفید فام لوگ اس کا من پسند نشانہ تھے۔ وہ سفید فاموں کے کالوں پر صدیوں کے ظلم کا تنہا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے یہ رویہ اس قدر جوش و جذبے سے اپنایا، کہ اپنے پرائے اس کے دشمن بن گئے۔

عام طور پر وہ مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں مسلسل تیرہ گھنٹے تقریر کرنے پر مشہور ہے۔ ظاہراً وہ بھارت کے موقف کا ہر پہلو واضح کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بین الاقوامی تعلقات کے ضمن میں مینن کی وجہ سے ہماری دوستی یورپ، امریکہ اور چین سے ختم ہوگئی، لیکن اس کے عوض اس نے روس، عرب اور افریقیوں کو ہمارا دوست بنا دیا۔

کرشنا مینن پنڈت نہرو کی تخلیق تھا۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں چینی حملے کے بعد جب نہرو کا اپنا ستارہ دھندلانے لگا، تو کرشنا مینن کی شامت آگئی۔ نہرو کی موت کے بعد کرشنا مینن کی شہرت کا ستارہ بھی ڈوب گیا۔ کمیونسٹوں نے اسے خون دینے کی کوشش کی، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مینن نے سپریم کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ اسے کچھ مقدمے ملے، لیکن اس نے مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور کئی موقعوں پر ججوں کو یاد دہانی کرانی پڑی، کہ وہ عدالت میں بحث کر رہا ہے، کسی سیاسی جلسے سے خطاب نہیں کر رہا۔ پھر کوئی مقدمہ اس کے راستے میں نہ آیا۔

تاریخ مینن کو کن الفاظ میں یاد کرے گی۔ ایک بے بنیاد انتشار کی مانند یا کسی شہاب ثاقب کی طرح۔ جو چمکا، تو ہر ستارہ ماند پڑ گیا، اور جب ٹوٹا، تو جہاں جہاں گرا،

وہ جگہ جلا دی، اور پھر خود بھی ناپُود ہو گیا۔ تیسری دنیا کے ممالک کی ناوابستہ تحریک، اس کا نہیں، پنڈت نہرو کا منصوبہ تھا۔ عربوں کے حقوق اور افریقیوں کی جدوجہد کا ساتھ اصل میں پنڈت جی نے دیا تھا۔ لیکن یہ مینن تھا، جس نے ان منصوبوں پر تقریریں کی، اور ان کو اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ کیونکہ وہ الفاظ کو رائج الوقت سکے کی مانند ڈھال سکتا تھا۔ یہ وہی کرشنا مینن تھا، جس نے پاکستانی جارحیت کی مذمت کی تھی، اور حیدر آباد اور گوا کو پولیس کے حوالے کرنے کو کہا تھا۔

مینن کوئی زیادہ عالم فاضل شخص نہیں تھا۔ اس کی اصل تعلیم ہیرلڈ لاسکی، اور لندن سکول آف اکنامکس تک محدود تھی۔ طباعت کتب میں اس نے چند روز گزارے۔ اس نے پیلیکن کتابوں کا صرف پہلا صفحہ ایڈٹ کیا تھا۔ سیاست نے اُسے اخبار کے علاوہ مطالعے کے لئے وقت ہی نہ دیا۔ لیکن نہ جانے وہ دوسرے سیاستدانوں اور پارلیمنٹرین سے برتر کیوں تھا۔ ویسے بھی ہندوستانی سیاستدانوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے برتر ہونا کوئی مشکل نہیں۔

کرشنا مینن نہیں جانتا تھا، کہ دوست کیسے بنائے جاتے ہیں۔ البتہ اس میں دوستوں کو کھونے اور دشمن پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس نے بے شمار معاشقے کیئے، اور کئی دل توڑے۔ اس نے محبت حاصل کی، اور چونکہ وہ محبت دے نہیں سکتا تھا، اس لئے یہ میدان بھی خاما سرد رہا۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میں صرف ایک خاتون کے ساتھ اس کے مراسم تھے۔ ایک رنگین، قابل دید اور شاندار شخصیت کا یہ افسوسناک انجام ہے۔

فرینک موریس

جب انسان مر جاتا ہے، تو سچ ختم کرنے کے لئے کسی کنونشن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فرینک موریس کی موت کے بارے میں خبروں پر اس کے دوست کم ہی یقین کریں گے۔ وہ ایسا شخص تھا، جو شراب، عورت اور اپنے کام سے اُسے ایک جیسی لگن تھی۔ شراب نوشی کے دوران وہ اکثر ذہنی طور پر حاضر ہوتا۔ اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر تحریر کرتا، اور جرأت سے کہتا، کہ جو اس نے سوچا ہے، بالکل درست ہے۔ اس کی بہت سی اعلیٰ خوبیوں میں سے ایک یہ تھی، کہ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتا، اور مقدور بھر کوشش کرتا، کہ لوگوں کے کام آسکے۔

ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر دیو داس گاندھی نے جرنلسٹوں کی میٹنگ کی، تو وہاں میری ملاقات پہلی بار فرینک موریس سے ہوئی۔ میٹنگ اس امر پر غور کرنے کے لئے بلائی گئی تھی، کہ حکومت کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کا کیا کیا جائے۔ دیو داس جتنا پابندی کے حق میں تھا، فرینک موریس اتنا ہی مخالف۔ ہمارا خیال تھا، کہ دونوں میں زبردست اختلافات ہوں گے۔ دیو داس کا خیال تھا، کہ اس کے دلائل زیادہ وزن دار ہیں، اس لئے فرینک کو اس کی بات مان لینی چاہیئے۔ فرینک کے لئے بڑا مشکل تھا، اس کی بڑبڑاہٹ سے جو ظاہر ہوا، وہ گالیاں تھیں، مرارجی ڈیسائی کے لئے، دیو داس کے لئے، اور دوسرے ہمنواؤں کے لئے۔ اس بحث کا نتیجہ جذباتی شوروغل کے علاوہ کچھ برآمد نہ ہوا۔

فرینک مورلیس اسرائیل کا زبردست حامی تھا، اور صدر ناصر کا بے رحم نقاد۔
کنگسلے مارٹن جو ان دنوں میرے پاس دہلی میں ٹھہرا ہوا تھا، مجھے ایک واقعہ سُنایا: ۔
یہ واقعہ ایک ڈنر پارٹی میں پیش آیا۔ جو عرب لیگ کے ایک نمائندے کلوس معقود نے ترتیب دی تھی۔ اور قومی اخبارات کے مدیروں کا مصری سفیر سے تعارف کروایا جانے والا تھا۔ فرینک کو بہت اہم جگہ پر بٹھایا گیا۔ اس کی عزت افزائی کی گئی۔ سفیر کی بیگم کے برابر جگہ دی گئی۔ بات چیت کے آغاز کی خاطر معقود نے فرینک سے صدر ناصر کی اسرائیل کے ساتھ امن کی کوششوں کے بارے میں رائے لی۔ صدر ناصر جھوٹا ہے۔ فرینک نے جواب دیا۔ معقود کو شاید سُننے میں غلطی لگی۔ اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ مورلیس نے سفاک بے تکلفی سے اپنا جواب دہرایا۔

اسی وقت مہمان خصوصی اور اُن کی بیگم دعوت چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈنر بڑی خاموشی میں ختم ہوُا۔ کنگسلے کا کہنا ہے، کہ فرینک مورلیس نے اس دن پارٹی میں شراب کو ہاتھ تک نہ لگایا، اور کمال سنجیدگی سے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے میزبانوں سے اپنے درشت رویے کی معذرت طلب کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

اگر فرینک مورلیس سلور سٹون کے پاس نہ گیا ہوتا، تو آج سے دس سال قبل جگر کی سوزش کی وجہ سے مر چکا ہوتا۔ یہ نوجوان، خوبصورت اور ہمت مند، اور جرأت مند فری لانس فوٹوگرافر فرینک کی قریب ترین دوست بن گئی۔ اس نے بیماری میں اس کی تیمار داری کی، شراب نوشی پر قابو پایا، اور اسے ایک بیوی کی مانند آرام مہیا کیا۔ کیتھولک ہونے کی بناء پر فرینک کے لئے یہ ممکن نہ تھا، کہ وہ بیوی کو طلاق دے سٹون سے شادی کر لیتا۔ لندن میں سٹون کے گھر میں فرینک کی موت ہوئی۔ تاہم کسی نے بھی اس امریکی لڑکی کی تعریف میں دو الفاظ نہ لکھے۔

فرینک کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے ڈوم کی سوانح عمری پڑھنی چاہیئے۔ "میرے بیٹے کا باپ"، اس نے اپنے دادا کی تمام خوبیاں ورثے میں حاصل کیں۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ حساس تھا۔ اپنے دوستوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور اتنی زیادہ پی سکتا ہے، جتنی فرینک اپنی جوانی کے دنوں میں پیا کرتا تھا۔

گرو دیو - مکت آنند

بمبئی سے پچاس میل دور، لیکن بمبئی کے پُرشور ہجوم سے ہزاروں میل دور یہ جگہ میں نے پہاڑی کی ایک چوٹی سے دیکھی تھی۔ براؤن رنگ کے کھیتوں میں جگہ جگہ چاول کاشت کیے گئے تھے، اور بعض علاقے ایسے تھے، گویا شیو کیے گئے ہوں۔ پہاڑیوں کا ایک دائرہ جن کے نام ایسے ہیں، جیسے مندروں کی گھنٹیوں کی آواز۔ شمال میں مندا گی، ماؤلائی، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، اور تنگا شیور جہاں یہ غروب ہوتا ہے۔ اور اس وسیع و عریض وادی کے بیچوں بیچ سنہری دھاگے کی طرح تیجا ساندی بہتی ہے۔ ٹیک کے درختوں کے بڑے بڑے پتے جھکے ہوئے ہیں۔ پیپل اپنی تازہ کھال اوڑھے کھڑا ہے، اور ریشمی کپاس کے پھول کھلنے ہی والے ہیں۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ذہنی بیٹریوں کو چارج کرنے کے لئے اس سے بہتر جگہ روئے زمین پر کوئی نہیں۔ میں تو وہاں صرف یہ دیکھنے گیا تھا، کہ آیا میری روحانی بیٹری میں کوئی سپارک باقی ہے؟ میں بابا مکت آنند کو ملنے گیا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں کہ تمہارے آباؤ اجداد نے بے شمار بھگوان اور سوامی پیدا کیے ہیں۔ اور اگر تم اپنی اسی عمر میں مذہبی شخصیت بننے جا رہے ہو، تو اپنے قارئین کو اس کے اثرات سے بچانا۔ میں مذہبی دیوانہ نہیں بن رہا۔ لیکن لوگ جہاں ہیں، میں اُن کو وہاں سے ہٹا نہیں سکتا۔ اُن کے تجربات مجھ سے مختلف ہیں۔ وہ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں متجسس ہوں اور تجسس میرا پیشہ ہے۔

دس پندرہ روز ہوئے، ایک رات میری ملاقات بالیو گیشور سے ہوئی۔ میں نے اُسے کسٹم کی مشکلات کے متعلق یقیناً نہیں پوچھ رہا تھا۔ میں ایک گھنٹہ مائی لوگ شکتی سرسوتی کی حاضری میں بھی رہا۔ میں اُن لوگوں سے بھی ملا، جو کرشنا کے پجاری ہیں، لیکن مجھے کسی آشرم جانے کا اتفاق نہیں ہوا، اور مکت آنند جی کا وجر لیشوری کا یتیم خانہ بہت موزوں بنایا گیا ہے۔

آشرم بھی کئی اقسام کے ہیں۔ گاندھی جی نے ٹالسٹائی فارم اور سبرامتی آشرم بنا رکھا تھا، جہاں اُن کے پیروکار اپنا کھانا خود تیار کرتے تھے، اور اپنے لیے کپڑا خود بُنتے تھے۔ عبادت کی بجائے کام پر زیادہ زور تھا۔ جے پرکاش نرائن کا بھی الگ آشرم تھا، جہاں صرف کام ہی کام تھا، عبادت کا ذکر ہی نہیں تھا۔ گورو دیو مکت آنند کی بات ہی اور ہے۔ زیادہ وقت عبادت اور مراقبے میں گزارا جاتا ہے، اور تھوڑا وقت کام کاج کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی عمارت خاصی بڑھیا ہے۔ سنگ مرمر اور چاندی کا بے انتہا استعمال کیا گیا ہے۔ قیمتی قالین اور فرنیچر، جدید بنگلے، سبزیوں، پھلوں کے باغات، جہاں، ٹماٹر، کیلے، آم، چیکو اور پپیتا کی کاشت کی گئی ہے۔ اور ایک کالا ہاتھی جس کا نام سوامی وجے آنند ہے، اور جو چارے کے لیے اپنی سونڈ اوپر اٹھاتا ہے، لیکن اُسے سب سے زیادہ آم اور غیر ملکی چاکلیٹ پسند ہیں۔

مکت جی آنند، دوسرے گوروؤں سے مختلف ہیں۔ ٹیک وڈ سے تیار کیے گئے استقبالیہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں جہاں ان کا انتظار کر رہا تھا، جب وہ داخل ہوئے، تو مجھے یوں محسوس ہوا، کہ ایک ایسا شخص سامنے ہے، جس کی لاکھوں لوگ خدا کی مانند پرستش کرتے ہیں۔ ان کی لنگی اور قمیض سنیاسیوں جیسی تھی۔ ان کی رولی ٹوپی پر پھندنا بھی تھا۔ گہرے شیشوں کی عینک لگائے وہ ایک بے محل سی شخصیت لگ رہے تھے۔ جب وہ سبز و کیڈ لگے صوفے پر بیٹھ گئے، تو ان کے رویے سے دوستی

اور بھائی چارے کی عجیب خوشبو برآمد ہوئی، جس کا مجھے پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔

"میں آپ سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یقیناً۔" انہوں نے جواب دیا۔ "میں اپنی عقل کے مطابق بہترین جواب کروں گا۔ لیکن پہلے آشرم پر ایک نظر کیوں نہ ڈال لی جائے۔ پھر واپس آ کر مجھ سے جتنے جی چاہے سوال کرو، بلکہ جس سے جی چاہے، پوچھو۔"

مجھے برآمدے، کمرے، ڈائننگ روم اور لائبریری دکھائی گئی۔ مجھے برآمدہ نما کمروں میں لے جایا گیا، جو مراقبے کے لئے مخصوص تھے۔ وہاں میں نے کئی مرد، خواتین کو دنیا و مافیہا سے بے خبر پایا، جو کمر سیدھی رکھے پدم آسن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

سہ پہر کے بعد مکت آنند جی مراقبے کے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے اپنے غیر ملکی پیروکاروں کو طلب کیا۔ چار امریکی اور ایک فرانسیسی لڑکی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ مکت نند جی بنگلور کے رہنے والے ہیں۔ ہندی اور مراٹھی سمجھ سکتے ہیں۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے۔

"لوگ آپ کے پاس کیوں آتے ہیں —؟" میں نے ہندی میں پوچھا۔

"مختلف وجوہات کی بنا پر۔ کچھ ناخوش، کچھ پریشان اور کچھ متجسس۔"

سوال:۔ "وہ آپ سے کیا حاصل کرتے ہیں؟"

جواب:۔ "وہ ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ مراقبے کے ذریعے وہ اس قابل ہوتے ہیں، کہ اپنے آپ کو اور خدا کو، جو ہر ایک کے اندر ہے، جان سکیں۔"

سوال:۔ "کیا ذہنی سکون ہی ایک فقط مقصدِ حیات ہے۔ میرے خیال میں یہ خود غرضانہ بات ہوگی۔ ایک انسان کو اپنی نسبت دوسروں کو زیادہ دینا چاہیئے۔"

جواب:۔ "وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہے، جب کوئی شخص خود مکمل طور پر سکون حاصل کر لیتا ہے، تب وہ دوسروں کو بھی اس میں سے حصہ دیتا ہے۔"

ان کے چیلے بھی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں، اُما، دمیانتی اور چندرا۔ سب امریکی ہیں، لیکن ہندوؤں جیسے نام رکھ لیئے ہیں — "ہم صرف گھر سے بھاگے ہوئے بچے نہیں ہیں۔ ہم اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔" وہ کہتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں، کہ پہلے انہوں نے اپنی پریشانیاں منشیات کے ذریعے دُور کرنا چاہی تھیں۔

سوال:۔ "پھر اب کیسا لگتا ہے —؟" میں نے پوچھا۔

جواب:۔ "میں اس وقت بھی زیادہ خوش نہیں ہوں، لیکن مجھے سکون بہت ہے۔" اُن میں سے ایک جس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں، غالباً دمیانتی ہے، جواب دیتی ہے۔

سوال:۔ "سکون سے دنیا میں کوئی قابلِ ذکر چیز تو پیدا نہیں ہوئی۔ یہ تو ذہن کی بے آرام کرنے والی اُپج ہے، جس کے نتیجے میں ادب، موسیقی، سائینس میں شاہکار تخلیق کیئے گئے۔ یہ برقی ساز و سامان، پنکھے، ایئر کنڈیشنڈرز، بلب وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ان لوگوں کی ایجاد ہیں، جن کو ذہنی سکون نہیں تھا۔ دنیا ان کی تکلیف سے فائدے میں رہی۔"

جواب:۔ "ہم اتنے خوش ہیں، کہ ہم کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں رہی۔"

سوال:۔ "یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ آخر سائنسی ایجادات، مصوری اور موسیقی کے بغیر دنیا کیسی دنیا ہو گی؟"

جواب:۔ "جو کچھ ہمارے پاس ہے، ہم سب اس کو اچھی طرح تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم سب مائیکل اینجلو یا بیتھوون تو نہیں ہو سکتے۔"

سوال:۔ لیکن یہ مراقبہ، تو میری نظر میں وقت کا ضیاں اور خود غرضی کا حامل ہے۔ میں تو کوئی کتاب پڑھنے یا آنکھیں بند کر کے جاگنے کی بجائے حقیقتاً سونا زیادہ پسند کروں گا۔"

سب ہنسنے لگتے ہیں۔ مکت جی اپنے سب سے قریبی چیلے سری یا ندی سے پوچھتے ہیں، کہ کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ وہ مختصراً ساری بات بتاتا ہے۔ گرو دیو مجھے بات جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مکت آنند صاحب ہر ایک کو اپنی قربت کا احساس دلا دیتے ہیں۔ لیکن ان سے ملنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے، کہ وہ ان کی نظروں میں بہت ہی مقدم شخصیت ہے۔ اتنے مختصر وقت میں کسی ایسے آدمی سے قربت کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہم بحث کرتے رہتے ہیں، اور بالآخر مراقبہ اور کام کے تعلق پر رُک جاتے ہیں۔

”تم خود اس کا تجربہ کیوں نہیں کرتے—“ اُما کہتی ہے، جو آشرم کا نیوز لیٹر مرتب کرتی ہے۔ ”کسی ایسے شخص کو چاکلیٹ کا مزا سمجھانا بڑا مشکل ہے، جس نے کبھی بھی چاکلیٹ کو چکھا بھی نہ ہو۔“

تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اب پروفیسر جین اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ مجھے مخاطب کرتا ہے۔ ”ہر کوئی اپنا کام اپنی صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے۔ تم ہفت روزہ مرتب کرتے ہو، اُما ہمارا نیوز لیٹر۔ دونوں یکساں اہم ہو۔“ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں۔ وہ مسکراتا ہے، اور بات جاری رکھتا ہے۔ ”شیکسپیئر کو اپنی نظمیں اور ناول لکھنے میں ایک عمر گذر گئی۔ ہمارے گورُو دیو نے صرف سترہ دنوں میں ”شینٹ شکی ولاس“ لکھ دیا ہے۔ یہ ضمیر کے متعلق ایک ڈرامہ ہے۔ یہ شیکسپیئر کی ہر تحریر سے بلند ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ذہنی اُپج یا تحریک کی وجہ سے نہیں کرتے، بلکہ اس کا باعث ہمارے ذہن کا مکمل سکون ہوتا ہے۔

لڑکیوں کا خیال ہے، کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے مفرور نہیں ہیں۔ اگرچہ آشرم کی زندگی سکون و آرام کی زندگی ہے۔ تاہم صبح ساڑھے تین بجے اُٹھنا، سارا دن کام، عبادت اور مراقبہ کرنا اور وہ نہایت پابند ماحول میں کوئی آسان کام نہیں۔“

”آخر کس مقصد کے لئے—؟“ میں پوچھتا ہوں۔ ”میں خدا پر یقین نہیں رکھتا، اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں، تو پھر میں اپنے اندر کے خدا کی تلاش کیا کروں—؟“

”تمہارے اندر اس سے کہیں زیادہ اعتماد ہے، جو تم بیان کر رہے ہو۔“ تمام

لڑکیاں ایک دم بول اُٹھتی ہیں۔ ”آؤ ہمارے ساتھ چند دن آشرم میں گذار کر دیکھو۔“

”تم جیسی خوبصورت لڑکیاں مجھے راہ سے بھٹکا دیں گی۔“ میں کہتا ہوں۔

وہ خوشی سے مسکراتی ہیں۔

میں مکت آنند جی سے اجازت لیتا ہوں۔ اور اُن گستاخ سوالوں کی معافی طلب کرتا ہوں، جو میں نے اُن سے اور اُن کے چیلوں سے کیئے تھے۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں، اور کہتے ہیں— ”یہ سوال گستاخ نہیں تھے، ایمانداری پر مبنی تھے، تم پھر بھی آسکتے ہو۔“

میں پھر وجیشوری جاؤں گا۔ دوسرے لوگ تو اپنی روحانیت تازہ کرنے جاتے ہیں، لیکن میں پھولوں میں لگی سُرخ آگ دیکھنے جاؤں گا۔ پہاڑوں کی تازہ اور صاف ہوا میں سانس لوں گا۔ اور مکت آنند جی سے اس بات کی ضمانت لوں گا، کہ میں اتنا گستاخ نہیں ہوں، جتنا اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔

منظور قادر — ایک بچھڑا ہوا دوست

میرا نہایت ہی عزیز دوست بستر مرگ پر پڑا ہے۔ میں اس کی مزاج پرسی کے لیے نہیں جاسکا۔ اس کے بیوی بچے مجھ سے ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے فاصلے پر تھے میں ان سے ملنے نہ جاسکا۔ میں ان کو خط نہ لکھ سکا نہ ہی فون پر حال معلوم کیا وہ پاکستانی ہیں۔ میں بھارتی ہوں — ہم کیسے ہمسائے ہیں — کیا ہمیں مہذب کہلوانے کا حق ہونا چاہیے۔

میں نے اخبار کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔ ایک دوست فون پر مجھے بتاتا ہے کہ میرا پرانا یار چلا گیا ہے — خون میری رگوں میں منجمد ہوجاتا ہے۔ میں نے اخبار ردی کی ٹوکری سے نکالا۔ سیاہ اور سفید پٹی میں لکھا تھا۔ منظور قادر کا انتقال ہوگیا۔ جب وہ لندن میں آخری سانس لے رہا تھا۔ میں بمبئی میں "ودودھ بھارتی" سن رہا تھا اور شراب کی چسکیاں لے رہا تھا اور جب اسے لاہور میں آبائی قبرستان میں آتارا جارہا تھا میں کولابا میں اپنے ہاتھ افسوس سے مل رہا تھا۔ وہ پاکستانی تھا میں بھارتی —

کہا جاتا ہے کہ جب کوئی مر رہا ہو تو اس کی ساری زندگی اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے منظور قادر کے مرتے ہوئے احساس کے سامنے سے گذرا ہوں گا کیونکہ وہ بھی مجھے ایک عزیز دوست کی مانند سمجھتا تھا سارا دن میں یہی یاد کرتا رہا میری اس کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی اور ہم ایک دوسرے کے قریب کیسے آئے۔ "تیس سال قبل پہلی ملاقات میں ہمارے درمیان موضوع زیر بحث موت تھا۔ اس کی بیوی اصغری کے بھائی نے اپنے باپ میاں فضل حسین کو آخری

خط لکھا تھا میں اس کے ریفرنس دیتا رہا۔

میں موم بتی کی روشنی میں کام کر رہا ہوں
اس کا شعلہ بھڑک رہا ہے
یہ ختم ہوگئی ہے

منظور قادر تضادات کا مجموعہ تھا۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ کوئی زیادہ ہونہار نہیں تھا۔ لیکن وہ پاکستان کا قابل ترین وکیل بنا۔ قانون کے بعد اس کی زیادہ دلچسپی عہد نامۂ عتیق اور قرآن کا مطالعہ تھی۔ وہ شروع سے آخر تک لاادری نظریہ پر کاربند رہا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا اور اردو زبان میں اس نے چند بہت اچھی نظمیں تخلیق کیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انتہا درجے کا رجعت پسند، تقریر میں ناپ تول رکھنے والا اور سلیقے سبھاؤ کا قائل تھا۔ اگرچہ پنجابی گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن ہندوستانی زبان کا رسیا تھا اور بڑی صاف زبان بولتا تھا۔ وہ بڑا مفصل بیان تھا لیکن بور نہیں کرتا تھا وہ منشیات کا مخالف تھا لیکن گفتگو میں شمپین کی بوتل کی طرح زندہ دلی کے بلبلے چھوڑتا تھا۔

اس کے کردار کے نمایاں پہلوؤں میں رحم دلی، دیانتداری تھی اس نے کبھی کسی کے بارے میں نقصان دہ گفتگو نہیں کی۔ اس کی دیانت داری ایمان کی حد تک وسیع تھی وہ پچاس ہزار روپیہ ماہوار کماتا تھا۔ لیکن انکم ٹیکس والے ہر سال اسے زائد جمع ہونے والا ٹیکس واپس کرتے تھے۔ وہ روپے پیسے کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے منظور قادر نہیں — اس کے اندر ولیوں کی سی سچائی تھی۔

دوستوں کی نظر میں اس کی عزت و توقیر بے مثال تھی۔ تقسیم ملک کے کچھ عرصے بعد ہم کچھ دوست جی ڈی کھوسلہ کی کتاب "STERN RECKONING" پر گفتگو کر رہے تھے جس میں اس نے تقسیم کے دوران مشرقی پنجاب میں ہونے والے فسادات کو گناہوں کی سزا ثابت کیا تھا ہم کھوسلہ کو اس کے کٹڑ پن پر گید رہے

تھے۔ وہ اور اس بیوی ہمیں دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش میں تھے ایک دوست نے کھوسلہ نے مجھے پھر کو سوچا اور پھر کہا کہ نہیں — ہرگز نہیں — اس کے ساتھ ہی اس کے دلائل بھی ختم ہو گئے۔ ہمیں احساس تھا کہ منظور قادر کا ردِعمل کیا ہو گا۔ صحیح یا غلط۔ وہ ہماری اخلاقی انداز کا ستون تھا۔

منظور قادر کو سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اخبارات پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ بین الاقوامی حالات نے اس کی ناواقفیت بے پایاں تھی۔ لندن میں ایک دن ہمیں ڈاکٹر سن یات سن کی ایک نیوز ویل دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ منظور نے مجھ سے پوچھا یہ سن یات سن کون تھا۔ جب میں نے اس کی واقفیت عام کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تو کہنے لگا ہو گا سالا کوئی بنگالی ڈاکٹر —" بعد میں شام کو جب میں نے یہ واقعہ اس کی بیٹی شیریں کو بتایا تو اس نے اپنے باپ کو بُرا بھلا کہا اس نے مجھ سے قسم لی کہ میں کسی اور کو یہ واقعہ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے اپنا وعدہ نبھایا لیکن جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ صدر پاکستان محمد ایوب خان نے منظور قادر کو وزیر خارجہ مقرر کیا ہے تو میں نے مبارک باد کا تار بھیجا جس پر دیکھا تھا: "بنگالی ڈاکٹر سن یات سن کی طرف سے مبارک باد —"

جب وہ وزیر خارجہ تھا اس وقت میں نے اس کے ساتھ چھٹیوں کے چند دن گذارے میں اپنے گھر میں خود ہی مہمان کی حیثیت سے رہا (۱۹۴۷ء) میں جب میں نے لاہور سے ہجرت کی تو اپنا گھر منظور قادر کے حوالے کر دیا تھا جس نے اس کی خوب حفاظت کی۔ ہمارے سکھ نوکروں کی جان بچائی۔ رات کو انہیں بحفاظت سرحد پار کروائی۔ فرنیچر اور میری لائبریری کی تمام کتابیں مجھ تک پہنچائیں حتیٰ کہ میری شراب کی الماری میں بچی کھچی شراب بھی روانہ کر دی، اس نے مجھے بتایا کہ وہ وزیر خارجہ کیسے بنا۔ اس نے محمد ایوب خان کے آمرانہ رویے پر ایک میٹنگ میں سخت تنقید کی تھی۔ اس رات ایک ملٹری جیپ اُسے لے جانے آگئی۔ یہ جان کر کہ اُسے گرفتار کیا جا رہا ہے اس نے اپنے خاندان کو خدا حافظ کیا۔ اسے صدر کی رہائش گاہ لے جایا گیا۔

ایوب خاں نے اس سے کہا: "تم اگر مجھ پر یا میری حکومت پر تنقید کرتے ہو تو پھر تمہیں اس ذمہ داری کا اہل ہونا چاہیے۔ اور ان خامیوں کو درست کرنا چاہیے جن پر تم نے تنقید کی ہے —" منظور قادر جب گھر واپس آیا تو وہ وزیر خارجہ بن چکا تھا۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے منظور قادر تو کبھی کسی عہدے یا اقتدار کی خواہش نہیں تھی۔ وہ کبھی کسی سے الجھتا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو اس قابل سمجھتا تھا کہ اس سے اُلجھا جائے۔ وہ سیاستدانوں کی باتوں کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اپنے چار سالہ وزارتِ خارجہ کے دور میں اس نے بھارت سے بہتر تعلقات قائم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن جب اس نے یہ عہدہ چھوڑا تو اسے تاسف کا کوئی احساس نہیں تھا۔

اس نے مجبوراً چیف جسٹس کا عہدہ قبول کیا اور جب اسے چھوڑنا چاہا تو حکومت نے اُسے مجبور کیا کہ وہ ایسا نہ کرے اس نے حکومت کے خلاف ہر سازشی کیس میں بین الاقوامی ٹریبونل کے سامنے حکومت کی اعانت کی۔ سکندر مرزا ہو یا ایوب خاں، یحییٰ خان، یا بھٹو — پاکستان کا کوئی بھی حکمران منظور قادر کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

گذشتہ سال میں نے مری میں نتھیا گلی میں اس کے ساتھ ایک دن بسر کیا وہ بہت بیمار تھا۔ اُسے   کی بیماری تھی۔ لیکن پرانی دوستی کی خاطر وہ اسلام آباد تک کار چلاتے ہوئے مجھے لینے آیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جنرل ٹکا خاں سے لے کر ادنیٰ ترین لوگ بھی اسے راستے میں کتنے عزت و احترام سے ملے۔ ہاتھ ملانے اور سلام علیکم کہنے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اُس نے اپنی بیماری کی صعوبتیں نہایت بے جگری سے برداشت کیں اور مذہبی اعتقادات کا سہارا لینے سے انکار کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کی زندگی اب چند روز ہی رہ گئی ہے لیکن اسے موت کا کوئی خوف نہیں تھا مجھے یاد نہیں آ رہا کہ وہ اُردو کا کونسا شعر گنگنایا کرتا تھا لیکن اس کا مطلب کچھ ایسے تھا۔ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میں اس تاریکی کا ایک دلہن کی طرح استقبال کروں گا اور اپنے آپ کو اس کے بازوؤں میں

دے دوں گا۔ ہماری آخری ملاقات کے اختتام پر اس کی بجائے میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

لندن کے اسپتال میں اس کی گرتی ہوئی صحت کے متعلق ایک انگریز دوست نے مجھے بتایا۔ لیکن وہ بھی اس کی موت کے وقت وہاں نہیں تھی منظور رقادر جیسے دوست کے لیے خراجِ تحسین صرف آنسوؤں ہی سے لکھا جا سکتا ہے لیکن یہ آنسو کاغذ پہ گرنے نہیں چاہتیں اسے دوامی عزت حاصل ہے اور اس کی موت کا غم بھی دائمی ہے۔

ڈاکٹر ایس رادھا کرشن - ایک تخلیقی جوہر

"حیاتِ انسانی اولمپک گیمز کی مانند ہے۔" فیثاغورث نے لکھا تھا "کچھ تو کامیابی حاصل کرتے ہیں، کچھ کامیابی کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ محض تماشائی ہوتے ہیں اور یہ آخری گروہ فلاسفروں کا ہے۔" افلاطون نے ایک فلاسفر کی زندگی کو خاموشی، تنہائی اور دنیا و مافیہا سے بے خبری سے تعبیر کیا ہے۔ فلاسفر اچھائی کی تلاش میں ہی نروان حاصل کر لیتا ہے ویدانت اصلاح میں اسے چیتہ سندھی یعنی مل پاکیزگی کہتے ہیں۔

مولانا ڈاکٹر رادھا کرشنن کی زندگی، اولمپک گیمز کے ہر پہلو پر محیط تھی وہ تاجر تھا۔ تو کاروبار کے لیے آیا تھا۔ ایک ایتھلیٹ کی طرح جس نے (بھارت رتنا) سب سے بڑا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اور ایک فلاسفر جس نے اپنی نرم خو آنکھ سے دنیا کا کاروبار دیکھا اور اپنی ساری زندگی دانا پراشنتا سے کر چیتہ سندھی کی تلاش میں گذار دی۔ میں اسے زندگی کے ان تمام شعبوں میں سے گذرتے ہوئے دیکھتا رہا ہوں۔

پہلی ملاقات کے وقت وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب و اخلاقیات کا پروفیسر تھا۔ میں نے اس کی تمام تحریریں پڑھ رکھی تھیں اور اس سے گفتگو کے دوران اس کی تحریروں کے حوالے دیئے تھے مجھے یاد ہے میں نے اس کی خوشامد پسندی پر حملہ کیا تھا اور اسے زچ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ خوشامد پسند تھا اور اسے اچھا سمجھتا تھا جب وہ ماسکو میں سفیر تھا تو میں نے اسے سکھوں کی تاریخ کے تراجم جو میں نے کیے تھے بھیجے۔ اس نے جواباً میری غلطیوں کی نشاندہی کی اور مجھے ویدانت پڑھنے کا مشورہ دیا تاکہ سکھ ازم کے بارے میں وضاحت سے جان سکوں۔ وہ رحمدل گرو تھا اور جن لوگوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا

تھا ان کے لیے تکالیف بھی اٹھاتا تھا۔

۱۹۵۰ء میں جب وہ فلورنس کی یونیسکو کانفرنس میں بھارت کی نمائندگی کے لیے گیا تو میں اس کے زیادہ قریب آگیا۔ اس وقت میں اس کا پریس آفیسر تھا۔ ہر صبح اور شام ملاقات ہوتی۔ میں اس کی تقریر کی رپورٹنگ کرتا اور اس کے انٹرویو طے کرواتا۔ کانفرنس میں اس کی تقریر بہت ہی مدلل تھی اس نے نہایت عمدہ تقریر کی۔ لیکن جب وہ واپس آیا۔ اسے دو دفعہ ہی خطابہ کرنا تھا چنانچہ وہ فارغ ہو کر اپنی کتابوں کی طرف راغب ہوا جو اس کے بستر کے قریب بکھری پڑی تھیں۔ وہ صرف حالات سے واقفیت رکھتا تھا لیکن کانفرنس کی کارروائی کو ذہن پہ سوار ہونے نہیں دیتا تھا۔

بھارت نے کمیونسٹ چین کو تسلیم کرنے کی قرارداد پیش کی تھی اور اس موقع پر اسے ایک سیشن سے خاص طور پر خطاب کرنا تھا اس مسئلے پر اس نے جو کچھ کہنا تھا کہا لیکن اپنے دلائل واضح کرنے کے بعد اس نے حاضرین سے ایک سوال کیا جو اس کے دماغ کی اولین سطح پر موجود تھا "بڑھتی ہوئی انسانی شخصیت میں تنہائی کی اہمیت ہے" ذہن کی دمکمل خاموشی، قوت ارادی، روح کا خلا محفل کا فقدان ___ اس روشنی کی کمی جو ہمیں صحیح بنی نوع انسان بننے میں مدد دیتی ہے"

وغیرہ وغیرہ

ایک مشہور و معروف ہالی وڈ فلم سٹار غالباً مرنیالائے نے رادھا کرشنن کے ساتھ فلسفے کے چند مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے وقت مانگا۔ میں اسے ڈاکٹر کے کمرہ، آرام میں لے گیا۔ وہ دھوتی اور بنیان میں ملبوس اپنے بستر میں دراز تھا۔ اس نے کتابوں ایک قطار پرے دھکیلی، بستر پر جگہ بنائی اور اپنی میزبان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ فلم ایکٹریس نے ہچکچاہٹ محسوس کی۔ شاید وہ ایک فلاسفر کے پاس بیٹھنے سے اپنی حیثیت کم ہو جانے کے اندیشے میں تھی۔ رادھا کرشنن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا "خاتون آپ کتنے مردوں کی بیوی رہ چکی ہیں (اس وقت یہ خاتون امریکی وفد کے لیڈر پر شادی کے ڈورے ڈال رہی تھی) اس

نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ فلسفے پر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

کرشنا مینن کے نائب صدارت اور اشٹر پتی کے دور کے بارے میں کم ہی جانتا ہوں۔ جب اس نے مجھے یاد دہانی کرائی کہ مجھے اس سے ملے عرصہ ہو گیا ہے تو میں نے کہا کہ صدر کا وقت زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے اسے میرا جواب پسند نہ آیا وہ تو لوگوں کے کام آتا تھا بہت سے شرمناک حد تک اس کا استحصال کیا۔ اس نے کبھی غصے کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی لوگوں کی اس کمینگی پر برہم ہوا۔ میری اس کی آخری ملاقات تین سال قبل مدراس میں ہوئی۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھ کا آپریشن ناکام ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی وہ میری بیٹی سے اس کے مستقبل کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ اس نے بردل سے فرش پر اپنے سلیپر ٹٹولے بستر سے اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا "جب بھی مدراس آؤ تو ملے بغیر نہ جاؤ ___" مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ صرف تین سال زندہ رہے گا۔ شاید وہ ایک کامیاب ترین انسان تھا جو میری نظر سے گذرا۔ مجھے گیتا کے شید یاد آرہے ہیں۔

" انسان اکیلا ہی اپنا دوست ہے

انسان اکیلا ہی اپنا دشمن ہے"

اسی طرح دھماپد میں لکھا ہے۔ انسان ہی اپنا آتا ہے اور انسان ہی اپنا مقصد ہے جب بھی مجھے اس کی یاد آتی ہے اس کے اس مضمون کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے جو اس نے ہندوازم کے بارے میں لکھا تھا۔ ۸۱ صفحے کے اس مضمون کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

" زندگی برج کے کھیل کی طرح ہے۔ ہم کھیل ایجاد نہیں کرتے یا پتے ڈایزائن نہیں کرتے۔ ہم قوانین مرتب نہیں کرتے اور نہ ہی کھیل کی حالت پر کنٹرول کرتے ہیں۔ پتے خود ہمیں کنٹرول کرتے ہیں ___ اچھے یا برے ___ لیکن ہم اچھا کھیل بھی کھیل سکتے ہیں اور برا بھی ___"

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بہت ہی اچھا کھیل پیش کیا

رامن راگھاؤ۔ اسے پھانسی دو!

جب ایک شخص دوسرے کو قتل کرتا ہے، تو ہم اس کی وجوہ تلاش کرتے ہیں جب ایک شخص بہت سے لوگوں کو قتل کرتا ہے، تو ہم اس کے دماغ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رامن راگھاؤ، چھبیس مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کا اعتراف کر چکا ہے۔ اس وقت وہ دو دشمنوں کو قتل کرنے کے الزام میں ملوث ہے۔ اس نے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ جج نے اس کے وکیل کا یہ استدلال برطرف کر دیا ہے، کہ رامن فاتر العقل ہے۔ "میں پاگل نہیں ہوں ——" رامن کہتا ہے —— "تم سب پاگل ہو ——"

رامن نے یہ راستہ کیوں اپنایا —— اپنے اعتراف کی بناء پر وہ اس وقت کا بہت بڑا قاتل کیوں بنا؟ میں نے یہ سب اس کے اعترافی بیانات اور اس کے ڈاکٹر کی رائے سے اخذ کیا، جس نے اس کا علاج کیا تھا۔

رامن کا تعلق تامل ناڈو کے گاؤں سے ہے۔ اس کے خاندان کے چھ افراد ہیں۔ ماں کے لئے اس کے دل میں بہت کم پیار ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے، کہ اسے اپنے باپ سے بہت پیار تھا۔ اس پیار کی توجیہہ وہ عجیب طریقے سے کرتا ہے۔ "میرا باپ مجھے چوری اور قتل کرنا سکھاتا تھا۔ وہ خود بھی ایسا کرتا تھا۔ اور کئی دفعہ ان جرائم کی پاداش میں جیل گیا تھا ——" رامن بتاتا ہے۔ "پدری اثر فیصلہ کُن تھا۔ "چوری بڑا عمدہ پیشہ ہے!" میں بچپن سے یہی کرتا آیا ہوں۔ اس نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ دو سال میں صرف تین کتابیں۔

رامن کے والدین بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ اس کے تین بہن بھائی (جن کو وہ بہت محبت کرتا تھا) بھی مر چکے ہیں، صرف ایک بہن پاربتی زندہ ہے۔

عورتوں سے نفرت رامن کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ اُن کے پاس ہوتے ہوئے بھی اُن سے نفرت۔ معاملہ کچھ سمجھ میں آنے والا نہیں۔ اس کے پہلے تجربے سے کچھ راز سے آگاہی ہوتی ہے۔ تامل ناڈو کی رسوم کے مطابق اس کی شادی اس کی بہن کی بیٹی سے طے پائی، جس کا نام گروایا تھا۔ شب عروسی سے پہلے ہی اسے چوری کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس دوران گروایا کو حمل ٹھہرا اور ایک مُردہ بچے کو جنم دے کر وہ دنیا سے سدھار گئی۔ یہ بیوفائی اور دھوکہ ایک مرتبہ پھر ہُوا۔ گاؤں کے بزرگوں نے اس کے لئے ایک لڑکی اور تلاش کی۔ رامن کو معلوم ہُوا کہ یہ عورت پہلے ہی کسی مرد کے ہاتھوں خراب ہو چکی تھی، اور اس کے بچے بھی ہیں۔ اُسے یہ بھی احساس ہُوا کہ وہ شادی کے بغیر بھی جو چاہے، حاصل کر سکتا ہے۔

بورسٹل جیل میں جس لڑکے سے رامن کی دوستی ہُوئی، اس نے اسے بمبئی بُلا لیا۔ یہاں اُسے پہلی مرتبہ جنسِ مخالف کا تجربہ ہُوا۔ دونوں دوست ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے تھے۔ رامن دن کی شفٹ میں، اور اس کا دوست رات کی شفٹ میں۔ ایک رات جب بارش زوروں پر تھی، اس کے دوست کی بیوی نے رامن کو اپنے بستر میں بُلایا۔ رامن نے انکار کیا۔ اگلے روز عورت نے اپنے خاوند سے شکایت کی، کہ گزشتہ رات رامن اس کی عزت پر حملہ آور ہُوا تھا، لیکن وہ بچ گئی۔ رامن کو اس گھر سے نکال دیا گیا۔

اس طرح رامن کو دھوکہ دیا گیا۔ اس کی بے عزتی ہُوئی، اور اس کو گالیاں دی گئیں۔ اس کا یقین پختہ ہو گیا، کہ ہر بدبختی کے پس منظر میں عورت ضرور موجود ہے۔ وہ عورت سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گیا، اور بھیڑیا بن گیا۔ اگر کوئی اسے کچھ نہ کہتا، تو وہ بھی کسی کو کچھ نہ کہتا۔ لیکن وہ بدمعاش بن گیا۔ وہ اکثر آوارہ گردی میں گرفتار ہُوا، اور پولیس کے تشدد کا نشانہ بنا۔

دھوکہ دہی، ڈاکہ زنی، چوری اور تشدد کے کئی مقدمات کے تحت اس نے کئی بار جیل یاترا کی۔ ایک دو آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد وہ ثبوت نہ ملنے کی بنا پر وہ چھوٹ بھی گیا۔ دو دفعہ اسے ذہنی مریض کی حیثیت سے ذہنی امراض کے اداروں میں بھی بھیجا گیا، مگر ہر دفعہ نارمل رپورٹ ملی۔ وہ بمبئی میں اپنے شب و روز کے بارے کہتا ہے:

"میں اکثر اوقات طوائفوں کے پاس جاتا تھا۔ میں مختلف عورتوں کے ساتھ، شب بسری کرتا رہا۔ میں چوری کرتا رہا، تاکہ زیادہ روپیہ حاصل کر سکوں۔"

"جنسی خواہش انسان کے سر پر مسلط ہو جاتی ہے — ہر شخص کو ضرورت ہوتی ہے —" وہ ڈاکٹر کو فلسفیانہ انداز میں بتاتا۔ "جس طرح کار کو پیٹرول کی ضرورت ہے، اسی طرح مرد کو جنسی تسکین کی۔"

اس طرح جنس اور جرم رامن کا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا، کہ رامن اپنی جنسی بھوک کہاں مٹاتا تھا۔ شاید شہر کے ریڈ لائٹ ایریا میں۔ لیکن چوری یا ڈاکہ زنی کے لئے وہ مضافات کے دور دراز علاقوں میں جاتا۔ خاص طور پر اُن لوگوں کے ہاں، جو سیلاب یا سیم کی وجہ سے نقل مکانی کر کے ایک دوسرے سے فاصلے پر رہنا شروع کر دیتے تھے، وہاں وہ رات کی خاموشی میں زنا کرتا، لُوٹتا اور قتل کر دیتا۔ اس نے علاقے میں دہشت پھیلا دی۔ لوگ شام ہوتے ہی گھروں میں قید ہو جاتے۔ وہ ان کو اُن کے گھروں میں آ دبوچتا۔ اکثر اوقات راہگیر صرف دس نئے پیسوں کے لئے قتل ہو جاتے، مگر ہر واردات بڑی پلاننگ سے ہوتی، اور تفصیلات ظاہر کرتیں، کہ یہ کسی ایک ہی فرد کی کارروائی ہے۔ پہلے پہل وہ کند آلات استعمال کرتا۔ بعد ازاں اس نے لوہے کے نوکدار ٹکڑوں کو استعمال کرنا شروع کیا، جسے وہ اپنے شکار کے کانوں کے پاس گھونپتا۔ جن لوگوں نے تاریکی میں اسے فرار ہوتے دیکھا، وہ کہتے ہیں، کہ اس نے داڑھی اور سر کے بال بڑھا رکھے ہیں، اور سادھوؤں کی طرح ترشول ہاتھ میں اُٹھا رکھی

ہے۔ کچھ کہتے، کہ قاتل کتے کا بھیس بدل لینے پر قادر ہے، یا بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے۔ اس کے اعترافات سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھا، کہ یہ رامن راگھاؤ کا کام ہے۔ قتل کی ہر واردات ہر کسی کا خون منجمد کر دیتی۔

ایک چائے فروش، جس نے رامن کو گندی چائے پیش کی، بڑی مشکل سے اپنی کھوپڑی بچا سکا۔ دوسرے اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ ایک واردات کا اعتراف کرتے ہوئے رامن کہتا ہے — "میں نے ایک باریش مسلمان کو اپنی کھاٹ پر سوئے ہوئے دیکھا۔ صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے لوہے کی مضبوط سلاخ اس کے سر پر دے ماری۔ داڑھی والا وہیں مر گیا۔ اس واردات میں اُسے دو سو باسٹھ روپے حاصل ہوئے۔ لیکن چند روز بعد کی واردات میں اسے صرف دس نئے پیسے اور تھوڑا سا گُڑ میسّر آ سکا۔ چند روز بعد پھر رامن نے ایک خاندان پر حملہ کیا۔ کچھ دنوں تک وہ ان کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ اس نے بتایا، کہ اس کوٹھڑی میں ایک کھاٹ پر ایک مرد، عورت اور بچہ لیٹے ہوئے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میں پچھلی دیوار سے اُوپر چڑھا، اور دیکھا، کہ عورت بچے کو پاؤڈر والا دُودھ پلا رہی ہے۔ میں نے سونے کی ایک زنجیر عورت کے گلے میں دیکھی۔ تین بجے تک عورت کو نیند نہ آئی۔ میں تین چار روز اس کوٹھڑی میں جاتا رہا، ہر دفعہ عورت بیدار نظر آئی۔ پانچویں روز وہ سوئی ہوئی تھی۔ میں دروازے کے قبضے کاٹ کر جھونپڑی کے اندر داخل ہوا۔ دو چارپائیوں کے درمیان خالی جگہ پر کھڑے ہو کر میں نے مرد پر دو تین بار لوہے کی سلاخ سے ضرب لگائی، وہ مر گیا۔ عورت چلّانے لگی۔ بچہ صرف دو ماہ کا تھا۔ دو تین ضربوں سے بچہ بھی ختم ہو گیا۔ پھر میں نے عورت کو بھی ختم کر دیا۔ میرا خیال تھا، کہ میں عورت کے ساتھ سوؤں گا بھی۔ میں نے عورت کے گلے سے زنجیر نکال لی۔ اس کی گردن کے گرد کالا دھاگہ بھی تھا۔ میں نے وہ بھی کھول لیا۔ زنجیر اپنی جیب میں ڈالی۔ مجھے پھر عورت کے

ساتھ سونے کا خیال آیا۔ عورت کے بستر کے قریب مٹی کے تیل کا لیمپ تھا۔ میں نے روشنی گل کر دی۔ لیکن اسی وقت کسی نے بتی جلائی اُدھر۔ ایک عورت بھاگتی ہوئی اُدھر سے نیچے آئی۔ اس کی عمر ستر برس کے قریب ہو گی۔ جب اس نے خون دیکھا، تو چلّانے لگی، میں بھاگ نکلا۔

خون کی یہ ہولی راتوں میں کھیلی جاتی رہی۔ لوگ یا تو لوہے کے وزنی سریوں سے مرتے رہے، یا ان کی پیشانیاں چیر دی جاتیں رہیں، لیکن قاتل ہر بار کسی نہ کسی طریقے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کا سب سے زیادہ بہیمانہ قتل کچھ یوں ہے:

آدھے فرلانگ کے فاصلے پر ایک جھونپڑی میں ایک عورت اور دو بچے سوئے ہوئے تھے۔ بچوں کی عمریں آٹھ نو سال کی تھیں۔ عورت درمیان میں سو رہی تھی۔ میں نے تین چار ضربیں عورت کو لگائیں، وہ مر گئی۔ عورت نے اپنے آپ کو صرف ایک کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ تقریباً عریاں ہی تھی۔ میں اُس مردہ عورت کے ساتھ سویا۔ اور میں نے اس کی چھاتیاں بھی چوسیں، جن سے دودھ نکل رہا تھا۔

"کیا تمہیں خدا پر یقین ہے؟" ڈاکٹر نے رامن سے پوچھا۔

"جب میں چھوٹا تھا، تو خدا کو مانتا تھا، لیکن اب نہیں، میں مندر نہیں جاتا۔"

"کیوں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ خدا عورت کی جانبداری کرتا ہے۔" رامن نے جواب دیا۔

رامن کی یہ جنس زدہ نفرت اس کے جنسی استعارے کی واضح دلیل ہے۔ جب جیل کے نائی نے اس کی مونچھیں صاف کر دیں، تو وہ غیض و غضب میں آ گیا، اور نائی کو قتل کرنے کے درپے ہو گیا۔ سات دن تک اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ "یہ تو ایسے ہی ہے، جیسے کسی کا سر کاٹ دو۔ میں عورتوں اور زنخوں کی طرح نظر نہیں آنا چاہتا۔" اس نے ڈاکٹر کو وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اگر میں تمہارے بچے کو مار دوں، تو

تمہیں تکلیف نہ ہو گی؟ بالکل اسی طرح مجھے اپنی مونچھیں صاف کرنے کی تکلیف ہوئی ہے۔"

رامن کو عورتوں کی خواہش ہے۔ اُس نے انتظامیہ کو پیشکش کی ــــ "مجھ کو ایک سال کے لیے ضمانت پر رہا کر دیں۔ میں چوری یا قتل نہیں کروں گا۔ میں ایک سال کسی عورت کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، بیوی کی حیثیت سے نہیں، ساتھی کی حیثیت سے۔ عورت کی عمر تیس سال سے کم ہونی چاہیئے۔ اور اگر بچہ پیدا ہو گیا، تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہو گی، کہ وہ میرے بچہ کو پالے۔ مجھے طوائف بھی قبول ہے۔ میں اس سے ہمبستری کرنا چاہتا ہوں، روٹیاں پکوانا نہیں چاہتا۔"

رامن کے بقول اُسے مارا پیٹا گیا، اور اعتراف کروانے کے لئے گانجا بھی پلایا گیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ لیکن پھر اس کے اندر کی آواز نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔ "میں نے جبر کے زیرِ اثر اعتراف نہیں کیا، بلکہ میرے دل نے آواز دی، کہ اعتراف کر لو۔"

رامن راگھو سیاہ رنگت کا مضبوط بدن کا شخص ہے۔ وہ صاف ستھرا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بال، سفید قمیص اور کالی پتلون میں ملبوس (پولیس کمشنر ناد کارنی نے مجھے بتایا، کہ رامن اپنی پتلون تکیئے کے نیچے رکھ کر استری کرتا ہے۔)

اس کے ماتھے پر ہر وقت تیوری ہوتی ہے۔ اور ایسے معلوم ہوتا ہے، گویا وہ دنیا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی عبادت گزار کی طرح ٹہلتا ہے۔ جب جج کمرہ عدالت میں آتا ہے، تو وہ تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے۔ اور جو کرسی اُسے پہنائی گئی ہے، اس کے درمیانی سرے کو اس طرح پکڑے رہتا ہے، جیسے کوئی بادشاہ عصا کو۔ وہ عدالتی کاروائی بڑے انہماک سے دیکھتا ہے۔ وکیلوں کی آمد و رفت، سننے والوں کے چہرے۔ گویا کوئی بادشاہ اپنے دربار کا ملاحظہ کر رہا ہو۔ اور لوگوں کی آنکھیں ہمیشہ اس پر مرکوز ہوتی ہیں۔ جب وہ باہر نکلتے ہیں،

تو اس کی طرف پیچھا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ صرف ایک دفعہ ایک خوبصورت لڑکی نے مسکرا کر رامن کی طرف دیکھا، تو رامن کے چہرے پر ایک حریصانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی، تو رامن نے اعتراف کر لیا۔ جج نے پوچھا، "تم مزید کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں"، رامن نے جواب دیا۔ "حکومت نے مجھے سرکاری وکیل تو مہیا کر دیا ہے" لیکن نہانے کے لئے صابن اور سونے کے لئے عورت نہیں دی۔"

رامن کے اپنے ہی ضابطے ہیں۔ یہ اس کا قانون ہے۔ آفیسر کے سامنے سگریٹ نہیں پینا چاہیئے۔ آفیسر کو اپنی ڈیوٹی کے دوران تمباکو نوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس نے تشخیص کے دوران ڈاکٹر کی پیش کردہ سگریٹ واپس کر دی۔ اور اس دوران جب ڈاکٹر نے سگریٹ سلگائی، تو رامن نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بیرے پر جی بھر کر غصہ نکالا، جس نے پینے کے پانی کے ٹب میں اپنا ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس نے ایک بچی کو بُری طرح ڈانٹ پلائی، جس نے گندہ رومال رامن کو واپس کر دیا تھا۔

وہ تحریر کردہ الفاظ کی عزت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ جج سے ایک ہی بات پوچھتا، کہ پہلے بیان میں کیا لکھا گیا ہے۔ وہ کہتا، ٹھیک ہے، میں نے اعتراف کر لیا ہے، لیکن ریکارڈ درست رکھنا چاہیئے۔ وہ اپنا نام، پتے، اور کپڑے جو پولیس واردات سے پکڑ کر لائی، چیک کرتا۔

اس نے اپنے استعمال شدہ ہتھیاروں کی بھی شناخت کی۔ قرض کے متعلق بھی اس کے اپنے ہی اصول ہیں۔ "میں نے ہمیشہ ادائیگی کی، اور کبھی ادھار نہیں کھایا۔ یہ الگ بات ہے، کہ یہ ادائیگی کہاں سے ہوئی۔ میرے پاس رقم نہیں تھی، اس لئے میں نے

قتل کیا، اور رقم حاصل کی۔"

رامن راگھاؤ میں ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے، جسے خوف کا کوئی احساس نہیں۔ "ہم ناڈو، مرنے سے خوف نہیں کھاتے۔" وہ فخر سے کہتا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے بھی آگاہ ہے، جو اس سے خوفزدہ ہیں۔ اس نے بڑی رغبت سے عدالت میں اپنے ایک ہتھیار کی پہچان کرائی، حالانکہ اس وقت لوگوں کے سانس رُکے ہوئے تھے۔

"ڈرو نہیں۔" وہ لوگوں سے کہتا۔

میں نے صرف ایک دفعہ اس کے چہرے پر خوف کی ایک موہوم سی لکیر دیکھی، وہ بھی چند ثانیوں کے لئے۔ اُسے ایک ایک تصویر دکھائی گئی، جس میں دو لاشیں تھیں۔ انہیں کے قتل پر اس پر مقدمہ چلا تھا۔

"کیا تم انہیں پہچانتے ہو، جنہیں تم نے قتل کیا ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔

رامن راگھاؤ کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی لکیر اُبھری۔ پھر اس نے فوراً اُن پر سے نظر ہٹائی، اور کہا،

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میری نظر کمزور ہے۔"

ستیہ جیت رے

کیمرہ مین پہلی بار کسی فلم کے شاٹس لے رہا تھا۔ آرٹ ڈائریکٹر کا یہ دوسرا تجربہ تھا۔ کاسٹ میں شامل اداکاروں کی اکثریت پہلی مرتبہ کیمرے کے سامنے آئی تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہدایت کار باقی ممبروں کی طرح خام تھا۔ اس فلم کی تکمیل میں تین سال صرف ہوئے۔ شوٹنگ بھی صرف ویک اینڈ پر ہی ہوا کرتی تھی، جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت حاصل کرتے۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے کام کئی کئی ماہ تعطل کا شکار رہا۔ لیکن نتیجہ کے طور پر جو کچھ پردۂ ظہور پر آیا، نقادوں نے اسے فلمی دنیا کا شاہکار مانا۔

پتھر پنچالی نے ستیہ جیت رے کو فلمی دنیا کا سب سے بڑا ڈائریکٹر بنا دیا۔ اس نے بھارتی سینما کو ایک سچا شاعر عطا کیا۔ اپراجیتو اور آپور سنسار فلمی دنیا میں خوبصورت شاعری کا خوبصورت نمونہ تھیں۔ شاید ڈان سکوئی کے میکسم گورکی سہ المیہ سے بھی زیادہ اعلیٰ۔ ایک درجن سے زائد فیچر فلموں اور کئی چھوٹی فلموں کے بعد ستیہ جیت رے بھارتی فلم انڈسٹری کی پہچان بن چکا تھا، خاص طور سے غیر ملکی ناظرین کے لئے۔ درحقیقت ایک ایک نقاد کی اس رائے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد اگر ثقافت کے میدان میں کسی نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے، تو وہ ستیہ جیت رے ہے۔

ستیہ جیت کی فلموں نے بین الاقوامی سطح پر باوقار ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔

کینز، وینس، برلن اور سان فرانسسکو کے فلمی میلوں نے ستیہ جیت رے کی اس غیر معمولی ذہانت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن گذشتہ ہفتے تو اسے ایک بہت قیمتی ایوارڈ "میگا سے سے" سے نوازا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ پہلی دفعہ کسی فلم ڈائریکٹر کو نصیب ہوا ہے۔ اُسے فلمی دنیا کا شاعر مانتے ہوئے، اس کی فلموں کو مثبت اقدار کا حامل تصور کیا گیا ہے۔ اس کے ہیرو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

اپنے معاصر فلم سازوں مثلاً فرانس کے ترو فاٹ، سپین کا بیونل، سویڈن کا انگمر برگ مین، اٹلی کا فیلینی اور جاپان کا اکیا کیوروسوا سے فلم سازی میں بہت آگے تھا۔ اس نے ڈائریکٹر اور فلم بینوں کے درمیان تعلق پیدا کیا۔ سینما صرف تفریح کا سامان ہی مہیا نہیں کرتا، بلکہ تخلیقی فن کا ذریعہ بھی ہے۔ جس طرح کہ کوئی ناول یا مصوری کا نمونہ۔ ترو فاٹ کی "فیولمز ایٹ فم" اور رینائس کی "ہیروشما ملون آمار" میں کرداروں کی بجائے پلاٹ زیادہ طاقتور تھا۔ اور یہی پلاٹ ہدایت کار کا کسی بھی چیز کے بارے ذاتی نقطۂ نظر ظاہر کرتا ہے، اور فلم بینوں کو متاثر کرتا ہے۔

رے نے بھی یہی مقصد سامنے رکھا ہے۔ لیکن اس کا طریقہ مختلف ہے۔ وہ شانتی نکیتن میں مصوری کے اُستاد نند لال بوس کی بات یاد کرتا ہے — "درخت کی تصویر ضرور بناؤ، لیکن مغربی انداز میں نہیں۔ اُوپر سے نیچے کی طرف نہیں، درخت اُوپر کی طرف بڑھتا ہے، نہ کہ نیچے کی طرف"۔ رے کا کہنا ہے، کہ اس کی تعلیم، زندگی اور مستقبل کے لئے یہ کلیدی راہنمائی تھی۔

وہ فلموں میں اپنے ذاتی نظریات کو جگہ دیتا ہے، اور اس کی خواہش ہے، کہ اس کا پیغام اس کی ہر فلم میں شامل ہو کر عوام تک پہنچے۔

کیا رے کا کوئی نظریۂ زندگی ہے؟ دوسرے عظیم ہدایت کاروں کی طرح وہ بھی طے شدہ اصولوں کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ہر فلم میں اس کا نظریہ زیادہ واضح

اور مناسب سمت والا نظر آتا ہے۔ اپنی پہلی پہلی فلموں میں وہ بھارتی بلکہ بنگالی مرد پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ لیکن بعد کی فلموں (جس میں چارولتا زیادہ مشہور ہے) میں عورت اس کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ وہ اخلاقی فیصلے کو ٹھکرانے کے خلاف ہے ــ "دیوی" میں وہ توہمات کے خلاف "ترقی پسند" طاقتوں کے ساتھ اتحاد میں شامل نہیں ہوتا۔ جبکہ "مہاپُرش" میں وہ مذہب کو نرمی سے رگیدتا ہے۔ "فال ساگر" میں ایک مرتے ہوئے زمیندار سے اس کی پوشیدہ ہمدردی نظر آتی ہے۔ وہ مجسّم تناقص ہے۔ "کنچن چنگا" میں طبقۂ اُمراء کے خلاف اس کی نفرت واضح ہے، لیکن "تین کانیا" کی کہانیوں میں وہ ایک شخص کی تعریف کرتا ہوا نظر آتا ہے، جو سکاٹش جرابیں پہنتا ہے، آکسفورڈ کے جوتے استعمال کرتا ہے۔ نپولین کی تعریف میں رطب اللسان ہے، بلکہ واعظِ خود بین ہے۔

ستیہ جیت رے پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، کہ تشدّد، جنگ اور سماجی اصلاحات کے سلسلے میں وہ ناکام ہوا ہے۔ لیکن اگر اس نے ایسی کوشش کی بھی، تو وہ کامیاب نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ ہیرو کی سی دلیری کی بجائے ایک نرم خو انسان کی کوششوں پر یقین رکھتا ہے۔ پینی لوپ ہوسٹن کا کہنا ہے، کہ رے کے ہیرو، شاعر، ایسے ادیب جن کو پبلشر میسّر نہ آئیں۔ دائمی طالب علم، خواب دیکھنے والے، جو سوسائٹی میں مذاق کا نشانہ بنائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو کرکٹ کی باتیں کرتے ہیں، اور پیسہ کی دوڑ میں شامل ہیں۔ اپنے تضادات اور مجموعات کے لحاظ سے رے مکمل طور پر ایک بھارتی ہے۔ حقیقت پسندی، انسانیت، شاعری اور ہندوستانیت اس کی فلموں کی اصل رُوح ہیں۔

لیکن ستم کی بات ہے، کہ شک و شبہ سے بالاتر غیر معمولی ذہانت کے باوجود ستیہ جیت بھارتی فلم بینوں کے لئے اجنبی ہے۔ پھر پنچولی پر سرکاری حلقوں میں بہت

تنقید کی گئی، کیونکہ ان کے مطابق اس میں بھارت کا جو تصوّر پیش کیا گیا تھا، وہ مناسب نہیں تھا۔ فال ساگر کی تیاری کے دوران اُسے برقی قوس نہ مل سکے، جن کی اُسے شدید ضرورت تھی۔ رے خود افسوس سے اس بات کا اظہار کرتا ہے، کہ جو عزت اُسے مُلک سے باہر حاصل ہے، وہ اپنے مُلک میں نہیں۔ کیا اس سے وہ بددل ہو گیا ہے ــ نہیں! ہرگز نہیں ــ وہ کہتا ہے ــ "ذرائع کا محدود ہونا ہماری ہنرمندی کے راستے میں رکاوٹ ہے، اور ایسے ہی نامساعد حالات میں شاہکار تخلیق ہو سکتے ہیں ــ میں جس جگہ ہوں، اور جو کام کر رہا ہوں، اس سے بے حد مطمئن ہوں ــ"

ہم میں سے کتنے ایسے ہیں، جو اس کا اظہار کر سکتے ہیں؟

بلراج ساہنی

میں نے کئی جگہ یہ بات تحریر کی ہے، اور محسوس بھی کی ہے، کہ مرد اپنی بیٹی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ میرے دوست بلراج ساہنی کو بھی چند ماہ پہلے اپنی بیٹی شبنم کی موت کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ اس نے اس صدمے کو بظاہر بے جگری سے برداشت کیا، مگر ٹیس بہرحال دل میں موجود رہی۔

شبنم ایک نہایت ہی خوبصورت بچی تھی۔ زندگی اور مسکراہٹ سے بھرپور۔ حتیٰ کہ اُس کی عجیب حرکتوں میں بھی ایک دلچسپ خوبی موجود تھی۔ اس کی شادی ہُوئی، لیکن یہ شادی بربادی ثابت ہُوئی، اور شبنم کی زندگی سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ بلراج بھی مسکرانا بھُول گیا۔ آخری بار جب میری اُن سے مُلاقات ہُوئی، تو وُہ جُوہُو والے گھر میں تھے۔ میں نے جب شبنم کو یاد دلایا، کہ اس کی زندہ دلی کے قصّے تو پنجاب بھر میں مشہور تھے، تو اس نے صرف معذرت خواہانہ انداز میں سر ہلا دیا۔ جب کبھی ہم بلراج کے گھر جاتے، تو شبنم ہمیں کھانا اور بیئر سرو کرتی۔ بلراج کی تعریفی نگاہیں اپنی بیٹی کی حرکات و سکنات کا احاطہ کرتیں۔

میں بلراج کو گزشتہ چالیس سال سے جانتا ہُوں۔ مَیں کسی اور ایسے دوست کو نہیں جانتا، جس نے اتنی محبت دی، اور عوضانے میں کچھ بھی طلب نہ کیا۔ میں نے کئی بار اُس سے تیز و تند گفتگو کی، لیکن اُسے کبھی غصّہ نہ آیا، نہ ہی جواباً اس نے کوئی فضول گفتگو کی۔ اس کی محبت نہ صرف دوستوں کے لئے بے انتہا تھی، بلکہ وطن کے لئے بھی وہ

اسی احساس کا مالک تھا۔ وہ سکول ٹیچر کی حیثیت سے اس محبت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بمل رائے کی دو بیگھہ زمین میں اس نے رکشہ کھینچنے والے کا بھرپور کردار کر کے اس محبت کا اظہار کیا۔

میں نے بلراج کے مارکسی ہونے کو کبھی سنجیدگی سے نہ دیکھا۔ وہ تو غریب کا ساتھی اور اچھے کام کرنے والے کا معترف تھا۔ "داس کیپیٹل" اس نے اسی جذبے کے تحت مطالعہ کی تھی۔ اس نے ترقی پسند نمائندوں کی انتخابی مہم میں حصّہ لے کر اور قحط زدہ افراد کی مدد کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

کم لوگ جانتے ہیں، کہ بلراج مارکس، اینگلز یا لینن کی نسبت گرنتھ صاحب کا زیادہ مطالعہ کرتا تھا۔ اس کے مطالعے کے کمرے میں گرنتھ صاحب کا بڑے سائز کا نسخہ ہمیشہ کھلا پڑا نظر آتا تھا۔ اور اس نے اس کے اقتباسات زبانی یاد کر رکھے تھے۔ اپنی مستقل مزاجی کی مدد سے اس نے پنجابی لکھنا سیکھا، اور اپنے مضامین گورمکھی رسم الخط میں ٹائپ کیئے۔ بمبئی سے شائع ہونے والے پنجابی رسالے "رنجیت" کے لئے وہ کالم لکھا کرتا تھا، اور اس کے کالم بے حد عمدہ تھے۔

بلراج کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات اس کی زندگی کے تضادات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ یوم مئی (مزدوروں کا عالمی دن) کو پیدا ہُوا تھا۔ اور اس کی موت تیرہ اپریل کو خالصہ سکھ ازم کی سالگرہ کے دن ہُوئی۔ اس کی آخری خواہش تھی، کہ اس کی موت پر مذہبی رسومات نہ کی جائیں، لینن کی تعلیمات اور سُرخ جھنڈا اس کے پہلو میں رکھا جائے۔

کیا وہ کیمونسٹ تھا یا سکھ — ؟

بھگوان شری نیل کنٹھ ٹھٹھ جی

ستیہ سائی بابا سے اس کی مشابہت حیران کن ہے۔ سر پر ویسے ہی مکھیوں کے چھتے جیسے بال، آپ ہی کی طرح چمکدار آنکھیں۔ وہی نرم مسکراہٹ اور وہی زعفران رنگ کا چغہ ـــ وہ بھی ویسے ہی معجزے کرتا ہے۔ فضا میں ہاتھ لہراتا ہے اور اس کی ہتھیلی پر وبھوتی (مقدس راکھ) ہوتی ہے۔ اس کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ وہ بیماروں کو تندرست کر دیتا ہے۔ ایک شخص کا دعویٰ ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ معجزوں کا یہ مالک ۶۷ برس کا بھگوان شری نیل کنٹھ ٹھٹھ جی ہے جسے اس کے پیروکار مالک، راہنما، گرو اور خدا کا اوتار کہتے ہیں۔

اخبار میں اس کی آمد کے اشتہار بھی میری نظروں سے گذرے ہیں درشن کے خواہشمند امیر لوگوں کی رہائشی علاقے میں جاتے ہیں۔ نیل کنٹھ کا ایک پارسی پیروکار جوڑا بھی مجھے وہاں لے گیا۔

طویل ہال عبادت گذاروں اور ان کی نظموں سے بھرا تھا سب خوش لباس تھے اور اپر مڈل کلاس سے ان کا تعلق تھا ایک ڈائس پر ایک خالی کرسی رکھی تھی جس پر ریشمی غلاف تھا۔ اس کے پاس ہی دوسری کرسی پر بابا کی رنگین تصویر رکھی تھی اس کے فریم کے گرد ایک ہار تھا اور درجنوں اگربتیاں اس تصویر پر معطر دھواں پھینک رہی تھیں۔

بابا آئے ـــ سب لوگوں نے تعظیم کی۔ بعض نے ان کے پاؤں چھوئے ـــ وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے اور عبادت گذاروں کے ساتھ مل کر گانے لگے اوم نماہ سوایا روم ناموناراین، لکشمی، گناپتی اور دیگر تمام دیویوں کی عبادت کی جا رہی تھی۔

سرداء، دھرمانمسکار۔ انہوں نے ایک چاندی کے لیمپ کی مدد سے آرتی اکاری گانے اور تالیوں کی آواز عروج پہ پہنچ گئی اور اچانک ختم ہو گئی۔ نیل کنٹھ جی اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ہم چھ لوگ ان کے خاص کمرے میں بلائے گئے۔ ہم فرش پر ان کے پاؤں کے قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ گفتگو کی۔ ان کو ہندی زبان پر عبور نہیں تھا اس لیے اپنے ایک چیلے سے اکثر تیلگی زبان کا ہندی مترادف پوچھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک غریب کسان کے پانچ بیٹوں میں سے ایک ہیں۔ جب ان میں ورثہ تقسیم ہوا۔ تو ان کے حصے تھوڑی سی جوار آئی اور بیمار باپ بھی ان ہی کے حصے میں آیا۔

وہ کس طاقت کے زیر اثر ہیں ـــ وہ خود نہیں جانتے لیکن لوگوں کے ذہن میں عجیب عجیب باتیں ہیں جب انہوں نے ایک بیمار شخص کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس کا بخار غائب ہو گیا جب انہوں نے ایک شخص کی ٹانگ پہ ہاتھ رکھا جو گینگرین کی وجہ سے اسے کٹوانے ہسپتال جا رہا تھا تو اس کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی۔ ایک چیلہ جو میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ بتانے لگا کہ وہ دوبارہ زندہ ہوا ہے بابا نے مجھے دوسری زندگی عطا کی ہے کیا تم ان کے گرد روشنی کا ہالہ نہیں دیکھ سکتے ـــ" کیا میں نے بابا کے گرد روشنی کا جالہ دیکھا ـــ؟

انہوں نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں آگے سرکا ـــ انہوں اپنی ہتھیلی پر انگوٹھا رگڑا اور میرے سر پر تھوڑی سی راکھ گرائی۔ انہوں نے دوبارہ ایسا ہی کیا تو ایک براؤن رنگ کی رس بھری ان کے ہاتھ پر آگری ـــ اسے اپنے گلے میں لٹکا لو۔ انہوں نے کہا ـــ انہوں نے اپنی تصویر والا سٹیکر مجھے اپنی جیب پر لگانے کو دیا۔ ایک تصویر کار پر لگانے کو دی۔ اور ایک انگوٹھی انگلی میں پہننے کے لیے دی۔ جس پر ان کی تصویر کندہ تھی۔ ہم کچھ پھل ان کے لیے لائے تھے انہوں نے سارے کے سارے تقسیم کر دیئے " لیکن یہ صرف آپ کے لیے ہیں ـــ" ایک

خاتون نے مزاحمت کی۔ "میں جس چیز کو ہاتھ لگا دیتا ہوں وہ پرساد بن جاتی ہے"۔ انہوں نے کہا کہ اور عورت کو ایک سیب اور کیلا دے دیا۔ انہوں نے آندھرا پردیش کے ضلع کرنول میں ہمیں اپنے آشرم "اودم نگر" میں آنے کی دعوت دی جہاں اگلے دسمبراں کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس نے ہمیں دعائیں دیں اور ہم نے رخصت لی

شری نیل کنٹھ کے اندر ایک غیر فطرت ہے جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے سکون کا باعث ہیں۔ اور جو لوگ سپرنارمل ہونے میں یقین رکھتے ہیں ان کے لیے تو بابا کی ذات معجزوں سے بھری ہوئی ہے

ساتھی برت — عورت باز

آپ ایسے ادیب کے بارے میں کیا اندازہ لگائیں گے جس نے اپنی کتاب میں اینجلا، انیتا، این باربرا، بریڈا، کیرولین، کوئی، سنتھیا، ڈمی لورا، ڈورین، آئی لین، الزبتھ، ایمی، فاطمہ، گیبل جینی، ہیلن، آئرین، آئرس، جین، جنت، جوڈی، کاتھی، کرسٹینا، لارا، لیونا، لینڈا، لورنا لائن، مارگریٹ، میری ہے، موریا، نتالیا، نینسی، پینی لوپ، فیلس، رانتا، رونا، روزا، سیلی سانتا، سوزن، تانیا، ارسلا، ورملا، وینڈی اور "ے" نام کی ممنون ہوں

"ایک عورت باز ہندوستانی کے اعترافات" — اس کتاب کا کیا ٹائیٹل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے انعام نہیں دیا جا سکتا۔ ایک معروف ہندوستانی نقاد تو اسے پہلے ہی "فحش" قرار دے چکے ہیں۔ بد قسمتی سے کچھ ہندوستانی اس میں اپنا آئینہ دیکھ سکتے ہیں۔ جنسی دیدہ دلیری کے واقعات کے باوجود اس کتاب میں ایک بات ضرور موجود ہے اور وہ ہے "اعتراف"

بہت کم ہندوستانیوں نے اپنی تخلیقات انگریزی زبان میں پیش کی ہیں لیکن انہوں نے اتنی اچھی زبان پیش نہیں کی۔ لیکن ۳۲ سالہ ساتھی برت نے اعلیٰ برطانوی ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے اور نقادوں کی توجہ حاصل کر لی ہے۔

وہ عورت باز نظر نہیں آتا مختصر سا قد اور سر کے بال گنج کی طرف مائل مختصر سی داڑھی کے پیچھے کمزور سی تھوڑی۔ غیض و غضب کی حالت میں وہ خوبصورت لگتا ہے۔ انگریزی، بنگالی لہجے میں بولتا ہے تو مزاح کار معلوم ہوتا ہے۔ جب میلکم میگرج نے کہا تھا کہ اصل انگریز تو ہندوستان ہی میں رہ گئے ہیں تو یقیناً اس نے بنگالیوں کو بھی شمار کیا تھا۔

میری اور برت کی بات چیت بنگالیوں اور انگریزوں کی نفرت و محبت کے موضوع سے شروع ہوئی۔ بنگالی ہمیشہ انگریزوں کی طرح ادب تخلیق کرتے ہیں۔ ہندوستانی

ثقافتی روایات سے بالکل قطع نظر، لیکن دوسری طرف انتہاپسندی ہے۔ بنگالی ہندوستانی روایات پر پہرہ دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ان روایات کا محافظ سمجھتے ہیں۔ یورپ میں اگر کوئی قوم بنگالیوں کی طرح سوچتی ہے تو وہ اُمرشَن ہے۔ وہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز ہیں لیکن انگریزوں کی روایات سے انتہائی متنفر بھی۔ میں نے پوچھا "سفید چمڑی کے بارے احساس برتری رکھنے والے ہندوستانیوں کی کیا یہ خواہش نہیں ہوتی کہ کسی سفید لڑکی پر فتح یاب ہوں۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ ایک بنگالی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جس رات وہ انگریز عورت کے ساتھ سویا تھا اس نے محسوس کیا کہ تاج برطانیہ اس کے رحم و کرم پر ہے۔"

"کیا ہمیں بھارت میں جنسی انقلاب کی ضرورت نہیں، خاص طور سے درمیانی طبقے کیلئے"

"جنسی انقلاب مسئلے کا حل نہیں، کیونکہ یہ تو فوری طور پر آسکتا ہے۔ بنیادی طور پر جس تبدیلی کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ بزرگ نسل کی احمقانہ باتوں کی اطاعت سے گریز۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بزرگ نسل واقعی احمق ہے اور نوجوان نسل ہوشیار ہیں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک پچپن سالہ بوڑھے کو اس کی حقیقی عقل کے مطابق درجہ دینا چاہیئے اور یہ ہرگز فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ اپنے سے چند برس کم عمر سے وہ واقعی عقل مند ہے۔ بزرگی کی یہ ہیبت مکمل طور پر ختم ہونی چاہیئے اور جب تک ایسا نہیں ہوتا جنسی انقلاب ناممکن ہے۔"

"کیا دونوں طرف ایسا نہیں۔ بھارت کی نوجوان نسل نے بذات خود بوڑھوں کی یہ حکومت قبول کر رکھی ہے ــــ"

"ہاں ــ میں نے اپنی پہلی کتاب میں اپنے ایک ایسے چچازاد کی مثال دی ہے۔ جسے ایک کم ذات لڑکی سے محبت کرنے کی بنا پر بُری طرح پیٹا گیا تھا اور پھر اس نے کمال صحافت سے مجھے بتایا کہ اس کے باپ نے اسے ٹھیک ہی مارا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کے باپ کو اسی کا مفاد عزیز تھا۔ تو اس طرح یہ یکطرفہ کارروائی تو نہ ہوئی ــ"

"آپ بھارت کی نوجوان نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے ــ"

"اپنے ماں باپ کی سرپرستی سے جتنا جلد نکل سکیں نکلیں۔ اس کا نتیجہ بداعتصابی کی صورت میں تو ضرور نکلے گا لیکن اس پر قابو پایا جا سکتا ہے بالآخر مثبت نتائج حاصل ہوں گے بس مربیانہ اور سرپرستانہ انداز سے باہر نکلیں معاشی طور پر، سماجی طور پر جذباتی طور پر ــ"

"کیا آپ نے ایسا ہی کیا تھا اور اسی لیے بھارت سے باہر چلے گئے تھے ــ"

"مجھے کالج کی ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو کسی اور کی بیوی بن چکی تھی۔ میرے اندر بغاوت کا ایک شدید جذبہ پیدا ہوا اور یہی میرے لیے آخری سہارا تھا۔"

"اس فیصلہ کن علیحدگی میں کیا واقعات ہوئے ــ"

"میں ایک دقیانوسی برہمن گھرانے میں جوان ہوا۔ اس کی تمام تر پابندیوں کے ساتھ انیس سالہ نوجوان ہونے کے باوجود مجھے اپنی ماں کو بتانا ہوتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور رات ساڑھے نو بجے تک واپسی بھی لازمی ہوتی تھی۔ اگر کسی لڑکی کا فون آجاتا تھا۔ تو تمام کی تمام فیملی افراتفری کا شکار ہو جاتی تھی اگر سگریٹ پیتے دیکھ لیا جاتا تو سمجھو دنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مجھے برٹش کونسل میں ایک دعوت میں بلایا گیا۔ وہاں اور چیزوں کے علاوہ سکاچ بھی تھی پینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ انچ کے چوتھے حصے جتنی وہسکی جو سوڈے سے لبریز تھی میں نے ایک ایک سپ لے کر تین گھنٹوں میں ختم کی اور پھر مجھے پان کھانا پڑا اور چیونگ گم کھانی پڑی تاکہ گھر والوں کو اس کی بدبو نہ آسکے۔ میرے نام لکھے گئے خط کھول لیے جاتے تھے۔ یہ کام پوشیدہ نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی کو احساس تھا کہ وہ غیر معمولی کام کر رہے ہیں۔ ان تمام تکلیف دہ باتوں سے میرے اندر ایک ماحول پیدا ہوتا گیا۔ نہ صرف ان سے بلکہ سڑک پر چلتے ہوئے بزرگوں کی فرمائی ہوئی بہت سی یہ کرو وہ نہ کرو قسم کی باتوں نے مجھے باغی بنا دیا ــــ"

"آپ کا خیال ہے کہ بھارت میں ان پابندیوں اور ایسے ماحول کی وجہ سے تخلیقی کام کی حوصلہ افزائی ناممکن ہے اور یہ بھی ملک چھوڑنے کی ایک وجہ تھی۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ اسی وجہ سے بہت سے بھارتی ادیب، بھارت میں رہتے ہوئے اچھی انگریزی نہیں لکھ سکتے۔" "میرا خیال ہے کہ ایسا ممکن تو ہے لیکن وہ، وہ انگریزی نہیں ہوگی ــ اگر

تو ادیب تند آور ہے تو وہ بلا شرکتِ غیرے ایک اور زبان تخلیق کر سکتا ہے لیکن ایک باریک سی تمیز ضرور رکھنی پڑے گی۔ اس کی تحریر میں اس معاشرے کی جھلک ضرور ملے گی جس میں وہ رہ رہا ہے۔ زبان کی اہمیت وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ الفاظ کے مطالب کا فرق معاشرے میں آنے والی تبدیلی سے واضح ہوتا ہے۔"

"کیا خیال ہے مغرب میں تخلیق ہونے والا ادب فی زمانہ صرف الفاظ کی سفیدہ بازی اور محاوروں کی جادوگری نہیں — اور کیا اصل مسائل اور حقیقی تخلیقی تحریک ابھی تک بھارت ہی میں ہیں —"

یقیناً — ایک ناول نگار کے لیے یہ بہت زرخیز جگہ ہے۔ متنوع معاشرہ ثقافتوں کا تصادم، مذاہب کا تفرقہ یقیناً یکساں دوڑنے والے معاشرے سے زیادہ انگیخت کا حامل ہے۔ برطانیہ میں ایمپائر ختم ہونے اور طبقات کے جزوی طور پر ختم ہونے سے زندگی خاصی بے نمک ہو چکی ہے۔ ایسی بے نمک سوسائٹی کے اپنے فائدے اور نقصان ہیں، خاموشی، سکون، سست روی، جزوی طور پر باخلاق اور کام کرنے کے لیے بہترین ماحول — یہ ہیں ایسے معاشرے کے فوائد اور نقصانات ہیں مردہ پن اور سنجیدگی اور اس طرح لوگ شہرت حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ اور کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ میرے خیال کے مطابق مسائل کا حل یہ ہے کہ بھارت میں نہ صرف زندگی گذاری جائے بلکہ اسے دریافت کیا جائے یہ تمام مواد اکٹھا کر کے انگلینڈ جانا چاہیئے اور وہاں بیٹھ کر لکھنا چاہیئے —"

"کیا چار سو روپے یومیہ والے ہوٹل میں رہ کر آپ کو احساسِ جرم نہیں ہوتا —"

"نہیں ہرگز نہیں — میں نے انتہائی گھناؤنے اور غلیظ علاقوں میں زندگی گذاری ہے — میں اتنی غربت بسر کر چکا ہوں کہ میں ہر وقت اچھی رہائش اور اچھے ماحول کا متلاشی تھا اور میں اس میں کوئی احساسِ جرم محسوس نہیں ہوتا۔ جب دوسرے لوگوں کی غلاظت صاف کرتے ہوئے یا پھر یخنی کے چار فٹ ضرب چار فٹ کے کڑھاؤ مانجھتے ہوئے روزانہ بارہ تیرہ گھنٹے گذارے جائیں جیسا کہ میں کرتا تھا اور مزدوری میں چھ پاؤنڈ ہفتہ ملیں تو پتہ چلتا ہے کہ غریبی ایک جرم ہے۔ امارت کوئی جرم نہیں لگتا —"

"لیکن کیا اخلاقی طور پر بُرا نہیں لگتا کیونکہ بہت سے لوگ تو دو وقت کا کھانا حاصل نہیں کر سکتے —"

"بکواس — غربت میں کوئی رومان نہیں — غریب بھی اتنے ہی ذلیل ہیں جتنے کہ امیر — اور اس کے اظہار کے لیے ان کے پاس زیادہ ظالمانہ ہتھیار ہیں —"

آپ کی دونوں کتابوں اور آپ سے گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے برطانیہ جانے کا انتخاب اس لیے کیا کہ وہاں جنسی طور پر آزادانہ ماحول ہے —؟

"ہاں — میرا ابھی یہی خیال ہے — مرد اور عورت کے درمیان عقل و دانش کا تبادلہ جس میں جذبات، جنسیات اور شہوانیت شامل ہوں، بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کسی کو یہ تجربہ حاصل نہیں ہوا تو اس نے ایک معذور کی طرح زندگی گذاری ہے"

"کیا آپ اس بات کے حامی ہیں کہ شادی سے پہلے نوجوانوں کو اکٹھے رہنا چاہیئے بشرطیکہ وہ اس عمل کو جرم نہ سمجھیں —؟"

"بالکل — ہر حالت میں — خواہ وہ احساسِ جرم ہی رکھیں — آپ کسی دوسرے کے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں — صبح کے وقت بدبودار سانس رات کو بستر میں معطر ہو جاتی ہے — میرا مطلب ہے کہ یہ چیزیں زندگی کا حصہ ہیں۔ بھارتی مفروضات تبدیل کرنا پڑیں گے۔ لیکن تبدیل کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اصل نکتہ تو یہ ہے کہ زندگی انتخاب کا نام ہونا چاہیئے تا کہ قبولیت کا —"

"شادی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے — کیا اسے ایک کلیشے کے طور پر اپنانا چاہیئے — ایک دائمی بندھن —؟"

"ہرگز نہیں — میں اس خیال کا حامی نہیں کہ ایک مرد و عورت کو چالیس پچاس سال کے لیے جنسی معاہدے میں باندھ کر رکھ دیا جائے جیسے کہ آج کل ہو رہا ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ بندھن ستر پچھتر سال تک جاری رہتا ہے۔ گویا ایک جوڑا بیس سال کی عمر میں اس بندھن میں بندھتا ہے اور مزید پچاس سال بغیر کسی دوسرے سے جنسی تعلقات قائم کیے بیتا ہے — یہ انتہائی مضحکہ خیز ہے — یہ تو کسی کو شہید کرنے والی بات ہے —"

"اور بچوں کا کیا ہوگا ۔ وہ کہاں فٹ ہوتے ہیں —؟"

"ہاں یہ ایک مسئلہ ہے ۔ میرے پاس فی الحال اس کا کوئی حل نہیں اصل میں بچے ہی ہیں جنہیں اس سارے بکھیڑے میں تکلیف ہوگی۔ دراصل ہم ایسی کشتی میں اُبل رہے ہیں جہاں سے ہمیں ابھی پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے آخر کار رہنا کیا ہے —"

اصل میں شادی کا ارادہ اس وقت معرضِ وجود میں آیا جب انسان کی طبعی عمر تیس سال تھی یعنی ایک جوڑا شادی کے تقریباً دس سال ہی اکٹھے گذار پاتا تھا اور پھر باقی رہ جانے والا کسی اور کے ساتھ شادی کر لیتا تھا میرا خیال ہے یہ قدرتی حل تھا جنسی تنوع کا —؟"

"یہ بالکل درست ہے ۔ بہت سے لوگ آج بھی اس طرح کے معاہدے کر لیتے ہیں ہر پارٹنر اپنی جنسی سرگرمیوں میں آزاد ہوتا ہے ۔ لیکن یہ جذباتی صدمے کا باعث ہو سکتا ہے۔ کسی مرد کے لیے یہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کی بیوی آج کسی اور کے ساتھ سو رہی ہے۔"

"کیا آزادیٔ نسواں کی تحریک کا جذ دی عنصر بھی یہی ہیں —؟"

"یقیناً ہے — کیونکہ ہمیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ ایک مرد اگر ساٹھ ہزار عورتوں کے ساتھ سو سکتا ہے تو یہ اس کی مردانی قوت یا مردانگی کی نشانی ہے ۔ لیکن اس کے برعکس اگر عورت ایسا کرے تو اسے فاحشہ کہا جاتا ہے —"

"اور پھر سماج کی کچھ رسوم و قیود بھی تو ہیں —"

"تو اور کیا — فرض کریں کہ میں اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ سونے کی اجازت دیتا ہوں تو معاشرہ مجھے کیا کہے گا ۔ احمق ۔ بیوقوف گاڈدی — "ہم سماجی جمود میں نہیں رہ رہے آپ پر پیچیدہ اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ جلد ہی آپ اپنی بیوی سے کہیں گے" دیکھو ۔ تم اپنی یہ حرکتیں چھوڑ دو کیونکہ میں نہیں چاہتا یہاں جب میں لوگ مجھے احمق اور گاڈدی سمجھیں" اور وہ جواب دے گی" لیکن جب تم دوسری لڑکیوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہو تو پھر وہ کیا کہتے ہیں —؟ اوہ — اس کی فکر نہیں ۔ کیونکہ میں ایک مرد ہوں" یہ آپ کا جواب ہوتا ہے اور آپ وہیں پہنچ ہے ۔ جہاں سے آپنے سفر کا آغاز کیا تھا ۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے ۔ ہم ایک سو پچاس روپے کی خریدی ہوئی وائٹ واشن کے

آخری گھونٹ پی رہے تھے ۔ "یہ وُہی مکار آسٹریلوی آرٹسٹ ہے ۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟ وہ یہاں پر شراب پینے کے بہانے آنا چاہتا ہے ۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں، کہ وہ میری بیوی میں دلچسپی لیتا ہے ۔ میرا خیال ہے، کہ وہ اسے چاہتا ہے ۔

بالا صاحب ٹھیکری

ایس۔ ایس۔ چیف

بالا صاحب ٹھیکری (شیو سینا کا لیڈر) ایک امریکی رسالے نے اُسے فسطائی بیان کیا ہے۔ وہ خود یہ کہتا ہے، کہ ایک ہی کتاب ہے، جو میں نے پڑھی ہے، وہ ہٹلر کی کتاب مین کیمف ہے۔ مجھے اپنے خیالات کو دوسرے قسم کے لٹریچروں میں ملانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں نے بہت سے جلسے جلوسوں کو سُنا ہے، جو بالا صاحب کی شیو سینا نے کیئے۔ اور جس نے بمبئی کی زندگی کو ساکت کر دیا، اور جنوبی ہندوستان کے رہنے والوں کو دہشت زدہ کر کے رکھ دیا۔ دو ہفتے قبل جب میں ایئر انڈیا کی ایک پرواز سے سانتا کروز کے ایئر پورٹ کی طرف سفر کر رہا تھا تو اس کو دو جگہ رُکنا پڑا، تاکہ پرچم بردار سینا کے ہجوم کو شیواجی پارک جانے کا راستہ مل سکے۔ اگلے روز حکومت کے ان احکامات کے باوجود کہ پانچ یا پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اجتماع ممنوع ہے۔ اور اس یقین دہانی کے باوجود کہ دکانوں اور دفتر جانے والوں کو پورا پورا تحفظ دیا جائے گا۔ سینکڑوں درجنوں کی تعداد میں جمع ہوئے، اور انہوں نے بمبئی میں ایسی ہڑتال کرائی، کہ جس سے بارہ گھنٹے کاروبار مفلوج ہو کر رہ گیا۔ صرف وہی دکانیں کھلی رہیں، جن کی انہوں نے اجازت دی۔ صرف وہی گاڑیاں چلیں، جس کی انہوں نے ضرورت سمجھی۔ اور صرف اُن اداروں میں کام ہوا، جہاں کام کرنے کی انہوں نے اجازت دی۔ اُس دن بمبئی میں وزیر اعلیٰ وی۔ پی نائیک کی حکومت نہ تھی، بلکہ شیو سینا کے چیف بالا صاحب ٹھیکری کی حکومت تھی

میں نے اس سے ملنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ مگر اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے یہ سوچ کر خود پر ملامت کی، کہ کوئی آخر ایک نامعلوم صحافی کے ساتھ مل کر کھانے کی زحمت نہیں کرے گا۔

کیا ہٹلر، مسولینی یا سٹالن کسی عام ادیب جیسے ہیں، جیوانی یا ایوان کو جواب دینا پسند کریں گے؟ اسی خوف کی بنا پر ٹھیکری صاحب سے خود جا کر ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ بالا صاحب سانتا کروز کی شاہراہ کے قریب ایک خوبصورت جدید طرز کی کالونی کے ایک چھوٹے سے ولا میں رہائش پذیر ہیں۔ مجھے کوئی گارڈ نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ سامنے والا گیٹ بھی بند نہیں تھا۔ صرف ایک بڑا سا کتا جو کہ گریٹ ڈینز نسل کا تھا، ہم پر بھونکنے لگا۔ وہ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گریٹ ڈینز نسل کے کتے بہت اچھے دوست ہوتے ہیں۔ مگر وہ اتنے بیوقوف ہوتے ہیں، جتنے وہ بڑے ہوتے ہیں۔ بہتر تھا، کہ وہ السیشن نسل کا کتا رکھتا، جس کی خوراک کم ہوتی ہے، مگر خونخوار زیادہ ہوتا ہے۔

یہاں پر چیف بذات خود ہمارے سامنے موجود تھا۔ ایک عام قسم کا انسان جس نے پتھر کے بنے ہوئے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ سفید پاجامہ اور قمیض پہن رکھی تھی، اور کندھے پر شال ڈال رکھی تھی۔ اُس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیئے۔ خود اُس کے ہاتھ مجھے بڑے ملائم اور نرم محسوس ہوئے۔ "چیتا ایک شیر کو سلام کرتا ہے"، اُس نے مجھ سے کہا۔ چیتا شیو سینا کا نشان تھا۔

میں نے جواب دیا، "میں بہت ہی غریب سکھ شیر کی مثال ہوں"۔

وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا، جو کہ صوفے، بازوؤں والی کرسیوں ٹیلیفون اور ریڈیو سیٹ سے سجا ہوا تھا۔ میں نے وہاں شیواجی کی کئی تصویریں دیواروں پر آویزاں دیکھیں۔

گرم جوشی سے آؤ بھگت کرنے پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اسی اثنا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ جب بات ختم کر کے اس نے ریسیور رکھا، تو میں نے اپنی بات دہرائی۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا جواب دے سکے، ٹیلیفون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار جلد ہی اُس نے فون بند کیا، اور یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا، "یہاں ہماری بات چیت نہیں ہو سکتی، اوپر چلتے ہیں۔ آپ اپنے جوتے اتار لیں، کیونکہ دوسرے کمرے میں ہمارے دیوتا ہیں۔" میں نے ایسا ہی کیا، جیسا اس نے کہا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے کھانے کے کمرے سے گزرا، تو میں نے دیکھا، کہ وہاں ایک سن رسیدہ جوڑے اور شیواجی کی کئی تصویریں دیوار پر لگی ہیں۔ میں اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا۔ اُس نے مچھروں کی شکایت کرتے ہوئے درمیانے درجے کا پنکھا چلایا، اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ صوفے کے دوسری طرف شیواجی کی قدِ آدم تصویر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے مرہٹہ ہیرو کی تین اور تصویریں گنیں۔ میرا میزبان جب دیوتا کے بارے میں کچھ کہتا، تو اس کی مراد شیواجی ہوتی تھی (ایسا اس نے متعدد بار کہا) وہ شیواجی کے پورے القاب چھترا پتی شیواجی مہاراج کا استعمال کرتا۔ جب وہ یہ کہتا، تو اس کی آواز میں آہستگی آجاتی۔ جس سے اس کے ادب کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

بال ٹھیکرے ایک شریف اور شگفتہ مزاج آدمی ہے۔ انہیں ایک عقلمند آدمی سمجھا جاتا ہے۔ میں بھی اس بات پر پورا یقین رکھتا ہوں۔

وہ ایک بہت اچھا کارٹونسٹ ہے۔ اور اس کی آواز بڑی پُرکشش ہے۔ اور ان تمام خاصیتوں کا امتزاج بہت پُراثر ہے۔ میں یقین کر سکتا ہوں، کہ وہ سننے والے کو ضرور باندھ کر رکھ دیتا ہو گا۔ عام طور پر وہ جو کچھ کہتا ہے، اس کا زیادہ حصّہ مہاراشٹر کے رہنے والوں کے ساتھ ہونے والی بے انصافی ہوتا ہے۔ اور اس کی تنقید کا زیادہ تر نشانہ جنوبی ہندوستان کے رہنے والے بنتے ہیں۔ بال ٹھیکرے

کوئی اعلیٰ درجے کا سیاستدان نہیں ہے۔ اسے بے بس کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔

شیوسینا کے پاس مہاراشٹر میں رہنے والے غیر مقامی لوگوں کو دینے کے لیے کیا ہے۔ وہ کچھ مسلمانوں اور سکھوں اور مسلمانوں اور سکھوں کا نام لیتے ہیں۔ شیوسینا باقی ہندوستان کو کیا دے سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے وہ یہ دیتا ہے، کہ مجھے پنجاب، یو۔پی اور مدھیہ پردیش سے کئی دعوت نامے موصول ہوئے ہیں۔

میں نے اس سے اس الزامات کے بارے میں پوچھا، جو دہلی سے شائع ہونے والے بائیں بازو کے ایک رسالے میں اُن کے خلاف فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے کے لیے لگائے گئے تھے۔ انہوں نے اس سے انکار کیا، اور کہا، میں فرقہ پرستی کا نمبر ایک دشمن ہوں۔

وہ اُن مسلمانوں پر سخت تنقید کرتے ہیں، جو دوہری وفاداری رکھتے ہیں۔ اور اسرائیل کے خلاف ہونے والے ہنگاموں اور اُن سیاستدانوں، جن کی وجہ سے الاقدس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، پر تنقید کرنے پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

میں نے اس سے 'مین کیمف' کے بارے میں سوال کیا:

اُس نے غصّے سے جواب دیا، "ہاں، میں نے اسے پڑھا ہے۔" لیکن امریکی صحافی نے میرے ہٹلر جیسے ہونے کا جھوٹ بولا ہے۔ انہیں تجربات کی بناء پر میں صحافیوں سے کم ملتا ہوں۔

انگریزی پریس تو خاص طور پر میرے خلاف ہے۔ وہ جان بوجھ کر شیوسینا کی طاقت کو کم بیان کرتے ہیں، اور ہماری تحریک کے خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ اُس نے مجھے بیئر پیش کی۔ وہ مجھے اپنے والد سے ملانے لے گیا۔ پچاسی سالہ پیر بودھ نکر ٹھیکرے چارپائی پر چوکڑی مارے بیٹھا تھا۔ اُن کا کمرہ بھی گھر کے دوسرے کمروں کی طرح شیواجی کی تصاویر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک بہت بڑا شیواجی کا مجسمہ ایک کونے میں پڑا تھا۔

میں الوداع ہونے لگا، اس نے پھر میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیا۔ اور پھر اُسی طرح

گریٹ ڈینز نسل کے کُتے نے مجھے بھونک کر الوداع کیا۔

کیا وجہ تھی، کہ یہ انسان دوست شریف آدمی اس قدر انقلابی اور تلخ بن گیا۔ کیا بچپن کا کوئی تجربہ؟ یا والدین کی شفقت سے محرومی یا کوئی اور واقعہ، یہ سب کچھ معلوم کرنا ایک وقت میں بہت مشکل ہے۔ ہاں کچھ حقائق مجھے ضرور معلوم ہوئے ہیں، کہ وہ پونا میں پیدا ہوا، اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے۔ ایک ذہین کارٹونسٹ ہے۔ وہ فری پریس جرنل میں کام کر چکا ہے۔ کارٹونسٹ لکشمی، الوا سرابم اور ای۔ نرائن، جو کہ لنک کا ایڈیٹر ہے، اُس کے ساتھیوں میں سے ہے۔ کچھ عرصہ اُس نے اپنا اخبار مارمک نکالا۔ اس اخبار میں اُنہوں نے بمبئی کے رہنے والوں کی تکالیف اور مشکلات کو سامنے لائے۔ اس طرح وہ وہاں کے محروم لوگوں اور طبقوں کا رُوح رواں بن گیا۔ مارمک نے ہی شیوسینا کو جنم دیا۔

کیا بالا ٹھیکری جمہوریت کے لئے کوئی خطرہ ہے؟ میں سمجھتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ ان کی تحریک کا بمبئی سے باہر پھیلنے کا بہت کم امکان ہے۔ مہاراشٹر میں رہائش پذیر غیر مقامی لوگ مہاراشٹر کے مقامی لوگوں کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتے۔ باقی ہندوستان کے لئے شیوسینا کے پاس کچھ نہیں، جیسا کہ طاقتور آر۔ ایس۔ ایس کے پاس۔ اس کے علاوہ بالا صاحب نے مجھے قائل کر لیا، کہ وہ افسر نہیں ہیں۔ وہ ایک سیاسی رہنما ہے، یا شاید ایک قومی لیڈر۔ جس کا امکان کم ہے۔

دانیال وال کاٹ ۔ فضائی سمگلر

میرا اور اس کا سامنا ایک ڈنر پارٹی میں ہوا۔ میں ٹھیک طرح سے یہ نہ پوچھ سکا، کہ وہ دانیال وال کاٹ ہے، جو کہ ایک مشہور سمگلر ہے۔ مگر اس نے اس بات کو یہ کہہ کر خود ہی آسان بنا دیا، کہ تم السٹرڈ ویکلی کے ایڈیٹر ہو؟ یہ ہی میری پسندیدہ مطالعہ کی چیز ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، اور کہا، کہ آپ تو صحافیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ہاں میں کرتا ہوں، اور تلخی سے مسکرا کر بولا، وہ ایسے لوگوں کا گروہ ہے۔۔۔۔ جو کچھ وہ میرے بارے میں لکھتے ہیں، اسے پڑھ کر مجھے یقین نہیں آتا، کہ یہ سب کچھ میرے بارے میں ہے۔

وہ ہندوستان کی ہر چیز کے بارے میں تلخ رویہ رکھتا ہے۔ میں نے اسے جتایا، کہ وہ بہت سے لوگوں کے دل جیت چکا ہے۔ وہ لاپرواہی سے گزرتے ہوئے دہلی میں اپنے دوستوں کو چاکلیٹ اور سگریٹ بانٹتا ہوا پاکستان کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے" یہ درست نہیں ہے۔ میں یہاں سے اس لئے گزرتا ہوں، کہ یہ راستے میں پڑتا ہے، لیکن، یہاں سے کوئی تحفہ کسی کے لئے نہیں لایا۔

اس نے مجھے انڈین ائیر فورس کے ساتھ ایک مقابلے کے بارے میں بتایا، جو اُسے روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔ یہاں ہنٹر طیاروں کا گروہ تھا۔ اُنہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا، جبکہ میں پاکستان سے کافی دُور تھا۔ ایک طیارے نے مجھے واپس مڑ جانے کا حکم دیا، اور ڈرایا، کہ وہ مار گرائے گا۔ میں جانتا تھا، کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کسی بھی جنگی جہاز کو سلح کرتے ہوئے ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ اور کوئی جیٹ طیارہ زیادہ دیر تک نیچی پرواز نہیں کر سکتا۔

میں کافی نیچے آگیا، اور تعاقب کرنے والوں کو اپنی تکمیل کرنے کو کہا۔ اس وقت پاکستانیوں نے ہماری گفتگو سن لی، اور وہ میری مدد کرنے کے لئے آگئے۔ میرا کراچی میں شاندار استقبال کیا گیا۔ بھٹو نے ٹیلیفون پر مجھے مبارکباد دی۔

وہ ہندوستان میں اپنے اوپر ہونے والے دوبارہ حملے کے بارے میں زیادہ بات کرنے کا خواہاں نہیں تھا۔ مگر وہ اس پر اصرار کرتا رہا، کہ اُس نے کوئی چیز سمگل نہیں کی، اور یہ سب من گھڑت ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاست کے بارے میں حیرت انگیز طور پر بہت کچھ جانتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پاکستان کی جانب ہیں۔

وال کاٹ واپس پیرس چلا جاتا ہے۔ جہاں اپنے دوست کو دی ہوئی کار حاصل کرتا ہے، اور پھر لندن میں اپنے کاروبار کو منظم کرتا ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ ائیرویز کمپنی قائم کرنے کا، ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے پاس کافی دولت ہے۔

ایک بہت ہی خوشگوار اتفاق ڈنر پارٹی میں ہوا۔ مسٹر فلپ ٹالبوٹ، جو کہ صدر کینیڈی کے مشیروں میں سے تھے، اور بعد میں سفیر بھی رہے۔ شہر میں آئے۔ میں نے انہیں پارٹی میں جانے کے لئے راضی کر لیا۔ انہوں نے وال کاٹ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا تھا، لیکن اُنہوں نے ہماری باتیں سُن لیں۔ اور وہ ہمارے پاس آگئے۔ اور دانیال سے رسمی ڈپلومیٹک لہجے میں پوچھا، مسٹر وال کاٹ، کیا آپ ہندوستانی حکومت کے ساتھ ہیں؟ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا، ہاں، میں اس حکومت کا چھ سال مہمان رہا ہوں۔

ٹالبوٹ اس ذومعنی بات کو نہ سمجھ سکے، اور کہا، بہت خوب۔ میرا خیال ہے، آپ نے اپنا قیام خوشگوار گزارا ہوگا۔

ہماری زیرِ طبع مطبوعات

دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر اخبار ریاست کے اداریوں کالموں اور خطوط کا مجموعہ

فتنہ زار

ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نگار بلونت گارگی کی سوانح عمری

ننگی دھوپ

ہندوستان کی افسانہ نویس اجیت کور کی سوانح عمری

خانہ بدوش

ہندوستان کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار دلیپ کور ٹوانہ کی سوانح عمری

ننگے پاؤں کا سفر

۱۹۴۷ء کے واقعات پر مبنی رامانند ساگر کی عظیم کتاب

اور انسان مر گیا

مکتبہ شعر و ادب ○ سمن آباد ○ لاہور ۲۵